ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

مئی ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا	محمد غزالی ندوی	
۲۔	اداریہ	کاش کبھی اپنے آپ پر نظر جاتی	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	زندہ زبان میں زندہ مصحف (قسط-۵)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۷
۴۔	تاریخ کے جھروکوں سے	تاریخ پر یہ ستم!	ڈاکٹر بی، این، پانڈے	۹
۵۔	بحث و تحقیق	انکار حدیث کے بعد.....؟	محمد فرید حبیب ندوی	۱۷
۶۔	اسلامی تعلیمات	مشترکہ خاندانی نظام.....	محمد قمر الزماں ندوی	۲۵
۷۔	تذکرہ	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ.....	مولانا ندیم احمد انصاری	۳۶
۸۔	مقالات	تحریک پیام انسانیت اور مولانا علی میاں.....	جناب انیس چشتی	۴۲
۹۔	نقطۂ نظر	ندوۃ العلماء اور عرب دنیا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵۱
۱۰۔	عالم اسلام	اردغان حکومت اور فتح اللہ گولن.....	مسعود عالم ندوی	۵۵
۱۱۔	لمحۂ فکریہ	اگر اخوان دہشت گرد ہیں.....؟	شاہ اجمل فاروقی ندوی	۶۲

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

کاش کبھی اپنے آپ پر نظر جاتی

ہر شخص شکوہ کناں ہے کہ سماج بہت بگڑ چکا ہے، ہر زبان پر شکایت ہے کہ معاشرہ فساد زدہ ہوگیا، ظلم، چوری، انارکی، فحاشی، غیبت، چغلخوری، فریب دہی، تنگ نظری، بدنظری، حسد، کینہ اور تنگ دلی متعدی اور وبائی امراض کی طرح معاشرے میں عام ہوگئے ہیں، ساتھ ہی اس قدر آپسی دوریاں بڑھ گئی ہیں کہ اتحاد محض ایک تصور بن کر رہ گیا ہے، طرفہ یہ ہے کہ ہر جگہ بے شمار اصلاحی کوششیں ہو رہی ہیں، لٹریچر کا انبار ہے، جلسوں کی بہتات ہے، تنظیموں کی بھرمار ہے، کوششوں کی یلغار ہے، جگہ جگہ مدارس ہیں، لیکن صغائر کا شمار کیا! کبائر ہی تھمنے کا نام نہیں لیتے، اختلافات سے بچنے کا تصور کیا! باقی ماندہ اتحاد کو قائم رکھنا بھی مشکل نظر آتا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ملت کھوکھلی ہوتی جارہی ہے، اس کی طاقت ختم ہوتی جارہی ہے، افراد کی کمزوری اجتماعیت کی کمزوری کا سبب بن رہی ہے، خواص کا ہلکا پن ملت کو بے وزن کر رہا ہے، پھر اس نتیجہ کی توقع کرنا ہی فضول ہے جس کی بشارتیں اور جس کے وعدے نبی پاک ﷺ کے توسط سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا ہے، بلکہ اس صورت حال کا جو لازمی نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن خوش فہمیاں یا بداعمالیوں کی عادت موجودہ نتائج کو بھی بما کسبت ایدی الناس کی تعبیر وتفسیر تسلیم کرنے سے روک دیتی ہے۔

معاشرے میں پائی جانے والی ہر برائی تقریر وتحریر کا حصہ بنتی ہے، اتحاد پر کانفرنسیں پہ در پہ منعقد ہوتی ہیں، وسیع القلبی کے خوش کن گیت گائے جاتے ہیں، وسیع النظری کی سبز وادیاں دکھائی جاتی ہیں، قرآن وحدیث میں موجود وعیدیں پورے زور وشور سے سنائی جاتی ہیں، لیکن کاش ایسا ہوتا کہ یہ سب چیزیں خود صاحب تقریر وتحریر کی عملی زندگیوں کا حصہ بن جاتیں۔ تجربہ ومشاہدہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ غیبت وچغلخوری کی شناعت ہم بیان کرتے ہیں اور ہم ہی بغیر یہ سمجھے ہوئے اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ یہ عمل خود بھی اسی زمرے میں ہے، حقوق کا خیال، معاشرہ کی اصلاح اور برائیوں سے نفرت دلانا تو ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں لیکن اس سے بچنے کو محض توفیق الٰہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ بے طلب وبے عمل توفیق بھی نہیں ملتی اصلاح تو بہت دور کی چیز! اصلاح کی فکر میں سب کوشاں ہیں خود کی صلاح کا خیال نہیں! سادگی وتقشّف کی باتیں کرتے ہیں، واقعات وفضائل بیان کرتے ہیں، ایثار وقربانی کے قصے سنتے سناتے ہیں لیکن اف یہ ظالم دنیا! یہ

باتیں کرنے اور یہ قصے سنانے کے لئے کیا کیا اہتمام ہوتا ہے، کتنے اخراجات ہوتے ہیں اور کون سی آشائش ہے جس کی فراہمی میں کمی چھوڑی جاتی ہے، ظلم در ظلم تب ہوتا ہے جب ہم جیسے اصلاح معاشرہ اور دین کی خدمت کا دم بھرنے والے پندار تقویٰ تار تار کرتے ہیں اور قدم قدم پر بتقاضائے ''مصلحت وحکمت'' ایسے افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے نہ نفس کی اصلاح ممکن ہے اور نہ معاشرے کی اصلاح، نہ اپنے لیے نبوی مزاج کی تشکیل ممکن ہے اور نہ ہی نبوی معاشرے کی تعمیر ممکن ہے، بلکہ اس سے صرف شعوری اور لاشعوری خیانتیں فروغ پاتی ہیں، علمی وفکری اختلاف بھی انتشار ونفرت کا سبب بنتا ہے، گھر گھر دل تقسیم ہوتے ہیں اور امت کمزور ہوتی جاتی ہے، تکرار محض لا حاصل ہے ورنہ اوپر ذکر کیے گئے امراض پر اگر قرآنی آیات اور احادیث نقل کرنے کے ساتھ واقعات لکھنے بیٹھوں تو کتاب تیار ہوجائے، لیکن یہاں یہ مقصود نہیں! مقصد صرف یہ ہے کہ کوششوں کی بہتات کے باوجود ہر طرف یہ شکوہ کیوں عام ہے کہ اسلام دشمنوں کے نرغہ میں ہے، اسلام پر ہر چہار جانب سے یلغار ہے، مسلمان پوری دنیا میں ظالموں کے لئے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، ملت اسلامیہ کی حالت زار بڑی ناگفتہ بہ ہوگئی ہے، فساد ہے کہ زمین سے ابل رہا ہے، آسمان سے برس رہا ہے اور ہر شخص اور ہر گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے۔

اس کے جواب میں کسی تفصیل سے قطع نظر کہ (بہت کچھ لکھا جاتا ہے اور لکھا جا چکا ہے) صرف دو باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر اصول کو بیان کرنے کے بعد خواہ کسی اصول کی طرف اشارہ کیا ہو یا تفصیل سے احکام بیان کیا ہو لیکن اس سے متصل تصور آخرت کا ذکر ضرور بالضرور کیا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ انسانی زندگی کو اگر کوئی اصول اور کوئی قانون اور کوئی تصور راہ راست پر لاسکتا ہے تو وہ یہی تصور آخرت ہے، اس کا استحضار ہو اور اس پر یقین کامل ہو تو وہ رات کے اندھیرے میں بھی جرائم کے ارتکاب سے کانپتا ہے، ورنہ لاکھ جتن کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو روک نہیں پاتا خواہ سینکڑوں سی سی ٹی وی کیمرے کی نگرانی میں ہو، لیکن قرآن نے جس نگراں کیمرے (تصور آخرت) کا ذکر کیا ہے وہ اتنا مضبوط وحساس اور تیز تر ہے کہ اس کا تصور ہی گناہ سے بعض رکھنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

یہی تصور جب ذہن سے اوجھل ہوتا ہے تو آدمی دوسروں کی فکر میں تو لگتا ہے لیکن اسے اپنی فکر نہیں رہتی جسکے سبب وہ دوسروں کو ہمیشہ اصلاح کا طالب سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو صائب نیز اپنے آپ کو مبرأ سمجھتا ہے، پھر یہیں سے اختلاف وانتشار کے وہ جھونکے چلتے ہیں جو پوری ملت کو متأثر کیے بغیر نہیں رہتے، باریک بینی سے اگر مشاہدہ کیا جائے تو

ہم سب اسمیں مبتلا نظر آتے ہیں، صدق پر بشارتیں اور اس کی خوبیوں، کذب پر وعیدیں اور اس سے جنم لینے والی برائیوں کا تذکرہ، حق گوئی، غیبت و چغلخوری سے اجتناب، وسیع النظری، کشادہ قلبی، دینی بنیادوں پر تعاون (تعاون علی البر) حق کی حمایت، مکمل دین کی اتباع، خدمت خلق، دینی خدمت کا بے لوث جذبہ، بغض وحسد کی شناعتوں اور ایثار و مساوات کے فروغ کا مطالبہ صرف دوسروں سے ہوتا ہے، اپنی ذات میں یہ چیزیں صرف تحریر وتقریر کے ساتھ خاص نظر آتی ہیں،

دوسری بات یہ ہے کہ براہ راست قرآن کے مطالعہ سے تصور آخرت مضبوط و مستحضر ہوتا ہے، پھر اس کے نتیجہ میں اخلاص پیدا ہوتا ہے، خوف پنپتا ہے، اور اعمال صالحہ کی انجام دہی کے جذبہ کے ساتھ خود احتسابی کی دولت ہاتھ آتی ہے، خوف کے سبب انسان برائیوں، حق تلفیوں اور بغض وحسد نیز خاندان واقرباء پرستی اور ملوکی نظام کو ضرورت وحکمت اور مصلحت کا نام دے کر فروغ دینے سے پرہیز کرتا ہے، اخلاص کی وجہ سے اس کا ہر عمل اسکو ہر دلعزیز بناتا ہے اور دنیا اسے قابل تقلید سمجھنے لگتی ہے، اعمال صالحہ کا شوق اسے دشمن سے بھی حسن سلوک پر آمادہ کرتا ہے اور خود احتسابی کا تصور ہر قدم، ہر فعل، نوک قلم سے نکلنے والے ہر فیصلہ اور زبان سے ادا ہونے والے ہر جملہ کو عدل وانصاف کا شاہکار اور رہتی دنیا تک کے لئے مثال بنا دیتا ہے، پھر اس کی اصلاحی کوششوں میں جان پڑتی ہے اور آوازۂ اتحاد میں مقناطیسی کشش وتاثیر پیدا ہوتی ہے۔

لیکن صد حیف! کہ ہم خود گم کردۂ راہ بن کر چلے رہبری کا فریضہ انجام دینے، خود سبب انتشار بن کر کوشاں ہوئے ملت کو متحد کرنے کے لئے اور خود ساختہ نظریات اور خاندانی و جماعتی نظام کے خول میں مقید ہو کر دوسروں کو غیر اسلامی نظریات سے آزاد کرانے چل دیے، ہم خود ہی بھول گئے کہ پیغمبر علیہ السلام سے کہا گیا واصبر نفسك کہ جب وہ اپنے آپ کو ثابت قدم رکھیں گے تو باقی افراد ان کی اتباع میں رک جائیں گے، شاید یہ احساس بھی جاتا رہا کہ قوا انفسكم مقدم ہے اور و أهليكم بعد میں ہے اور پھر دوسرا مرحلہ و أنذر عشيرتك الأقربين کا ہے جسمیں بڑی کوتاہی نظر آتی ہے، پھر پتہ نہیں إن الله لا يغير ما بقوم حتى يغير ما بأنفسهم کا کیا مطلب ہم سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ قوم کی حالت کے بدلنے کی کوششیں کرنے والے جب فرداً فرداً اپنی اصلاح کریں گے تبھی قوم کی حالت بدلنا ممکن ہے، ورنہ اگر ہر شخص اپنے آپ کو اصلاح سے بالاتر سمجھ کر دوسروں کی اصلاح کرنے میں اور قرآنی نظریات ومواقف کو چھوڑ کر محض اپنے نظریہ پر ڈھالنے (خواہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں منجملہ دیگر نظریات ومواقف کے ساتھ صحیح کے زمرے میں ہی کیوں نہ ہو) اور اسی کو صرف برحق سمجھنے میں تگ ودو کرنے لگے تو نہ امت کی حالت بدلنا ممکن ہے اور نہ موجودہ فسادہ زدہ صورت

حال سے نکلنے کا کوئی راستہ، نہ انتشار سے بچنے کی کوئی صورت اور نہ ذاتی زندگی میں کبائر سے بچنے کا کوئی طریقہ، ایک تجربہ کار دوست اور دنیا کو بہت قریب سے دیکھنے والے کا ایک جملہ بہت متاثر کر گیا بلکہ جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ ''بہت سے لوگوں کو دیکھا اور بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی لیکن صحیح معنی میں مسلمان بہت کم نظر آئے'' ظاہر ہے کہ یہ جملہ اس شخص کی زبان سے سماج کے تعلیم یافتہ اور بہت خاص طبقہ کو قریب سے دیکھنے کے بعد نکلا، اسی لئے اس کے اولین مخاطب بھی وہی تعلیم یافتہ خاص لوگ ہیں، اب ذرا اس جملہ کے پیش نظر قرآن کریم کی تمام اخلاقی تعلیمات اور ذخیرۂ حدیث میں سے حصۂ سلوک ومعاملات اور اخلاقیات کو ذہن میں مستحضر کر کے ہم اپنی اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو شاید یہی احتساب نفس احتساب کائنات کا پیش خیمہ بن جائے، اور اپنی زندگی کی تبدیلی، ملی واجتماعی نظام کی تبدیلی کا مقدمہ بن جائے اور پھر ذرا ذرا سی بات پر برائیوں اور نفرتوں کے پنپنے کے بجائے عدل وانصاف کا چلن ہو اور اس کے صلہ میں واقعی ایک انقلاب کا آغاز ہو، پھر ذاتی انانیت ملی مفاد پر مقدم نہ ہو، خاندان پرستی اور ملوکی واستبدادی نظام کی چاہت دلوں سے نکل جائے اور گناہ کو گناہ سمجھنے کی توفیق حاصل ہو جائے، محض ذرا سے فکری اختلاف سے نفرتیں نہ وجود میں آئیں اور خود پسندی کا یہ جذبہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے جو امت کے شیرازہ منتشر کرنے میں بہت کارگر ہوتا ہے اور جسمیں ایسے ایسے لوگ مبتلا ہوتے ہیں کہ جن پر گمان کرنا بھی غلط تصور کیا جاتا ہے، لیکن خود پسندی ایسے لوگوں کو بھی یہی باور کراتی ہے کہ میرا کام، میرا نظریہ اور میرے لوگ اور میری جماعت ہی سیادت وتقلید کی مستحق ہے، کثرت سے یہ دعا کرنی چاہیے اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت (قسط-۵)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ھے''

زندہ زبان میں زندہ مصحف

تحریر: مسٹر اڈیار ☆☆☆ مترجم: ایم، اے، جمیل احمد

وید، بائبل اور دیگر مذاہب کے مصاحف اور قرآن شریف کے درمیان ایک عظیم فرق پایا جاتا ہے۔

ہندو مذہب کی بنیادی کتابیں چاروں وید ہیں اور ان ویدوں کی زبان سنسکرت ہے۔

سنسکرت کے معنی ہی نئی زبان اور نکھاری ہوئی زبان کے ہوتے ہیں۔

اگر یہ مانا جائے کہ وید آفرینش سے ہی انسانوں کو ملے ہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اصل سنسکرت میں نہیں بلکہ سنسکرت سے پہلے کی زبان میں رہے ہوں گے۔

بعد میں آنے والی زبان میں جب وید لکھے گئے تو ظاہر ہے کہ اصل وید میں اور نئی زبان میں لکھے ہوئے ویدوں میں فرق فطری بات ہے۔

مگر قرآنِ پاک عربی زبان میں نازل ہوا اور بالکل اسی زبان میں سرِ مو فرق کے بغیر آج بھی ہمارے سامنے ہے۔

یہودیوں کی توراۃ کو دیکھیے۔ اس کے نازل ہونے کے صدیوں بعد اسرائیلیوں نے اس کی تالیف کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توراۃ حضرت موسیٰ پر عبرانی Hebro زبان میں نازل ہوئی تھی۔ سینکڑوں برس بعد اس کو لکھا گیا۔ پھر یہ لکھا ہوا مجموعہ ضائع ہوگیا۔ لاطینی اور یونانی زبان کے بائبل ہی باقی رہے پھر اِن زبانوں میں توراۃ کے ترجمہ سے اسرائیلیوں نے پھر عبرانی Hebro زبان میں منتقل کیا۔ اس طرح سے ترجمہ سے اصل زبان میں منتقل کی جانے والی کتاب کا کیا حال ہوگا۔ اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ Dead Sea کے قریب غار قمران میں جو عبرانی زبان میں لکھے ہوئے کاغذات Scroles ملے ہیں وہ بھی صرف بائبل کے چند منتشر اجزاء ہی ہیں۔ یہ بائبل کی جدید ترین تحقیق ہے۔

اگر کوئی مصحف ترجموں سے بے نیاز اپنی نازل کردہ اصل زبان میں موجود ہے تو یہ امتیاز قرآن کریم ہی کو حاصل ہے۔

حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب سریانی کی ایک بولی 'آرامی' زبان میں تھی۔ لیکن اس کو پہلے پہل یونانی زبان میں لکھا گیا۔ پھر یونان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ پھر مختلف زبانوں میں ۔ اس طرح بائبل اپنی اصل زبان میں موجود نہیں ہے بلکہ ترجمہ کی زبان ہی میں ہمارے پاس ہے۔

مگر قرآن کریم جس زبان میں نازل ہوا تھا اسی زبان میں آج بھی ہمارے سامنے ہے۔

قرآن کریم کی ایک اور امتیازی صفت پر غور کیجئے:

☆ ہندو مذہب کے وید اپنی اصل زبان کے بجائے سنسکرت میں لکھے گئے، لیکن سنسکرت بھی آج بول چال کی زبان نہیں ہے۔

☆ یہودیوں کی مذہبی کتاب کی زبان 'عبرانی' بھی صدیوں تک بول چال کی زبان نہیں تھی۔ (اسرائیل نے اس زبان کو دوبارہ اپنے عوام پر مسلط کیا ہے)۔

☆ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی زبان 'آرامی' اور گوتم بدھ کی زبان 'پالی' دونوں آج بول چال کی زبان نہیں ہیں۔

جن جن زبانوں میں الہامی کتابوں کا نزول ہوا ہے وہ ساری ہی زبانیں آج مردہ ہو چکی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن اور قرآن ہی بول چال کی زندہ زبان میں زندہ کتاب کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور صفت پر غور کیجئے:

☆ چار وید

☆ یہودیوں کی کتاب توریت

☆ حضرت مسیحؑ کی انجیل

☆ گوتم بدھ کا مصحف، تمّا بدم

یہ سارے ہی مصحف جن ہستیوں کو ملے تھے ان ہستیوں کے انتقال کے عرصہ بعد ان کی تالیف و ترتیب ہوئی۔ مگر قرآن اور صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کو فوری طور پر ترتیب دے دیا گیا۔ اور جیسے جیسے وہ نازل ہوتا گیا ویسے ویسے اسے ترتیب دیا جاتا اور لکھا جاتا رہا۔

نبی کریم ﷺ اس کام کی نگرانی کرتے رہے اور اس سلسلہ میں خصوصی توجہ فرماتے رہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد ہی خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے پورے قرآن کو حضورؐ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق ایک جلد میں جمع کرا دیا۔ یہ کام انہوں نے قرآن کی حفاظت کے پیشِ نظر ہی کیا۔ جب قرآن اتر رہا تھا تو نبیؐ کے اصحابؓ اس کو جھلیوں اور پتوں پر لکھتے اور نبی کریمؐ کو سناتے گئے۔ قرآن کے صحیح طور پر لکھے جانے کا پورا اہتمام کیا گیا۔

جیسے جیسے یہ کتاب نازل ہوتی گئی ویسے ویسے خاص اہتمام کے ساتھ اس کو ٹھیک ٹھیک لکھنے کا انتظام ہوتا رہا۔ اتنے اہتمام اور احتیاط سے لکھی جانے والی کتاب صرف قرآن مجید ہے۔

☆☆☆

مفکر اسلامؒ - ایک مطالعہ

از

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

- تعلیم و تعلم اور تحریک و دعوت سے وابستہ ہر شخص کیلئے یکساں طور پر مفید ایک چھوٹی سی کتاب۔
- حضرت مولاناؒ کی ضخیم کاروان زندگی کی فکری تلخیص۔
- ایک نشست میں حضرت مولاناؒ کے افکار و اقدامات، دور اندیشی اور بے شمار کوششوں نیز بے لوث خدمات اور حق گوئی بے باکی سے روشناس کرانے والی کتاب۔

کم از کم ہر مدرسہ کا ہر طالب علم اس کا مطالعہ ضرور کرے

رابطہ کریں:

09627961774

تاریخ کے جھروکوں سے

تاریخ پر یہ ستم!

ڈاکٹر بی این پانڈے

نوٹ: ہم ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد کی ایک تحریر قسط وار شائع کر چکے ہیں، راقم کا خیال ہے کہ اورنگ زیبؒ کے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں شاید ان کی شخصیت کو اصل تصویر کے ساتھ پیش کرنے کی اتنی کوششیں نہیں ہوئیں، جب وہ تحریر شائع کر رہے تھے اسی دوران یہ تحریر بھی سامنے آئی، افادۂ عام کی غرض سے پیش کی جارہی ہے۔ (مدیر)

دو لفظ

ہندوستانی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ اسے کبھی حقائق کی روشنی میں خالص تاریخی نظریہ سے نہیں دیکھا گیا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' Divide and Rule کی پالیسی اختیار کر کے تاریخ کو مسخ کیا اور انہوں نے یہاں سے جانے کے بعد اپنے پیچھے ایسا گروہ چھوڑ دیا جس نے نہ صرف ان کا راگ الاپا بلکہ اس نے ان کے منصوبوں کو آگے بڑھایا اور ترقی دی۔

ملک کی آزادی کے بعد انگریزوں کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے میں ہی ہمارے کچھ سیاسی اور علمی حلقوں کو بھی اپنا مفاد نظر آیا۔ قوم پرستی کے گھناؤنے مفاد کے حصول کے لئے اپنے تعلیمی اداروں میں اسی مسخ شدہ تاریخ کے ذریعہ نئی نسل کی ہدایت و رہنمائی کا کام شروع کیا گیا۔ انہوں نے سماج کو توڑنے کے لئے تاریخ کو عداوت کی بنیاد کی صورت میں استعمال کیا تاکہ سماج میں متحد ہو کر بنیادی مسائل سے مقابلہ کرنے کی متحدہ قوت باقی نہ رہے۔ اس منصوبہ کو اتنے منظم انداز سے پھیلایا گیا کہ آج ہر شہر اور دیہات میں نفرت اور تعصب کا زہر موجود ہے۔

آج کے یہ حالات کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ سالہا سال کی منصوبہ بند کوششوں سے سیراب کیے گئے زہریلے درخت کے ہی پھل ہیں۔ ایسے حالات پیدا کیے بغیر ان لوگوں کے مفادات کا حصول اور تحفظ ممکن نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دور وسطیٰ کے ہندوستانی ادب اور تاریخ کو غلط رخ دینے کا جو کام ہوا ہے اس کے کئی میدان اور کئی رخ ہیں۔ ڈاکٹر بی این پانڈے کی یہ کوشش اس کے ایک چھوٹے سے جز پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میدان میں کچھ دیگر اہل علم حضرات کی کاوشیں بھی قابلِ ستائش ہیں جو باطل کی اس انتہائی ظلمت میں حق کا چراغ بن کر سچائی کو سامنے لاتی ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ کی سلسلہ وار تدوین سب سے پہلے ایلیٹ اور ڈاؤسن نامی دو انگریز دانشوروں نے کی۔ سبھی مراجع میں سے واقعات کو چن چن کر اسے اپنی خواہش و منشا کے مطابق ایک رخ دینا اور واقعات کی تشریح کرنا ان کا طریقہ اور خصوصیت تھی، لیکن انہوں نے کتاب کا نام دیا "The History of India as told by its own historians" (ہندوستانی تاریخ ہندوستانی تاریخ دانوں کے مطابق)۔ ان کے متعین کیے گئے رخ پر دیگر دانشوروں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

ہندوستانی اہل علم اور دانشور لوگوں میں سر یدوناتھ سرکار اور پنڈت ہر پرساد شاستری جیسے لوگوں نے اس میں چار چاند لگانے کا کام کیا۔ یہ لوگ انگریزوں کے پیروکار ہی نہیں، ان کے پرستار بھی تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں ہندوستانیوں کے خلاف انگریزی فوج کی مدد کے لیے اپنے تعلیمی اداروں کو فوجی بیرک میں تبدیل کر دیا تھا۔

انگریزوں نے اپنے طاقتور معاونین کے سہارے تاریخ کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی صدیوں سے باہم تعاون اور بھائی چارے کے ساتھ ایک جگہ رہنے بسنے والے دو فرقوں کے بیچ کی کھائی اتنی

چوڑی ہوگئی کہ لاکھوں انسانوں کے خون خرابے اور تقسیم ملک کے ساتھ انگریز بہادر کو سلامی دے کر رخصت تو کر دیا گیا لیکن نفرت اور تعصب کا دیوتا آج بھی جلوہ گر ہے۔ اس دیوتا کو خوش رکھنے کے لئے آج بھی انسانوں کی قربانی دی جارہی ہے، سیکڑوں دیہات اور شہر 'ہون' ہوا کیے جارہے ہیں اور رتھ یاتراؤں کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ ملک کا آئین اور پورا نظام کھوٹا ڈالے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس 'دیوتا' کے آگے سرنگوں ہیں۔

کیا انسانیت اس دیوتا کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی؟ ہرگز نہیں۔ ایسا اس لیے ممکن نہیں کہ وقت کی تیز دھارا پنے آگے کمزور بنیاد چٹان کو بہت دنوں ٹکنے نہیں دیتی۔

توقع ہے کہ جناب ڈاکٹر بی این پانڈے کے ذریعہ تلاش کیے گئے حقائق سے نوجوان نسل کو روشنی ملے گی۔ انہی کے طاقتور ہاتھوں سے ایک خوبصورت ہندوستان کی تعمیر نو ممکن ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے یہ توقع پوری ہو۔

(ناشر)

.....

تاریخ پر یہ ستم!

اڑیسہ کے سابق گورنر، راجیہ سبھا کے ممبر اور تاریخ نویس پروفیسر بی این پانڈے نے اپنے لکچر اور تحریروں میں ان حقائق اور واقعات کو اجاگر کیا ہے جن سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ تاریخ کو من مانے انداز سے توڑا مروڑا گیا ہے۔ ''اسلام اور ہندوستانی کلچر'' میں وہ لکھتے ہیں:

''اب میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے واضح ہوجائے گا کہ تاریخی حقائق کس طرح مسخ کیے جاتے ہیں۔

جب میں الہ آباد میں ۱۹۲۸ء میں ٹیپو سلطان کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا تو اینگلو بنگالی کالج کی طلبہ یونین کے کچھ عہدیدار میرے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ میں ان کی ہسٹری ایسوسی ایشن کا افتتاح کر دوں۔ یہ طلبہ کالج سے براہِ راست آئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ان کی نصابی کتابیں بھی تھیں۔ اتفاقاً میں نے تاریخ سے متعلق نصابی کتاب پر ایک نظر ڈالی اور ٹیپو سلطان سے متعلق باب کھولا تو مجھے یہ انتہائی حیرت ناک جملہ ملا:

''تین ہزار برہمنوں نے اس لیے خودکشی کر لی کہ ٹیپو انہیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا''۔

اس نصابی کتاب کے مصنف مہامہو پادھیائے ڈاکٹر ہر پرساد شاستری، صدر شعبۂ سنسکرت، کلکتہ یونیورسٹی تھے۔ میں نے فوراً ہی ڈاکٹر شاستری کو لکھا کہ انہوں نے ٹیپو سلطان کے تعلق سے مندرجہ بالا جملہ کس بنیاد پر اور کس حوالے سے لکھا ہے۔ کئی یاددہانیوں کے بعد ان کا یہ جواب ملا کہ انہوں نے یہ واقعہ میسور گزیٹیر سے لیا ہے۔ میسور گزیٹیر نہ تو الہ آباد میں تھا نہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں۔ تب میں نے میسور یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر برجیندر ناتھ سیل کو خط لکھ کر ڈاکٹر شاستری کے بیان کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے میرا خط پروفیسر شری کنٹیا کے پاس بھیج دیا جو میسور گزیٹیر کا نیا اڈیشن مرتب کر رہے تھے۔

پروفیسر شری کنٹیا نے مجھے لکھا کہ تین ہزار برہمنوں کی خودکشی کا واقعہ میسور گزیٹیر میں کہیں نہیں ہے اور وہ خود میسور کی تاریخ کے ایک طالب کی حیثیت سے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ٹیپو سلطان کے وزیراعظم ایک برہمن پونیّا تھے اور ان کے سپہ سالار بھی ایک برہمن کرشنا راؤ تھے۔ انہوں نے مجھے ایسے

۵۶ مندروں کی فہرست بھی بھیجی جنہیں ٹیپو سلطان سالانہ امداد دیا کرتے تھے۔ انہوں نے تیس خطوط کی فوٹو کاپیاں بھی بھیجیں جو ٹیپو سلطان نے شرنگیری مٹھ کے جگت گرو شنکر آچاریہ کو لکھے تھے جن سے سلطان کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ میسور کے حکمرانوں کی روایت کے مطابق ٹیپو سلطان روزانہ ناشتے سے پہلے رنگا ناتھ جی کے مندر بھی جاتے تھے جو شری رنگا پٹنم کے قلعہ میں تھا۔ پروفیسر شری کنٹیا کے خیال میں ڈاکٹر شاستری نے یہ واقعہ کرنل مائلس کی نام نہاد کتاب ''تاریخ میسور'' سے لیا ہوگا۔ اس مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے ٹیپو سلطان کی تاریخ ایک فارسی مخطوطہ سے ترجمہ کی ہے جو ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی لائبریری میں تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ملکہ کی لائبریری میں ایسا مخطوطہ ہی نہیں اور کرنل مائلس کی کتاب کے بیشتر واقعات غلط اور من گھڑت ہیں۔

ڈاکٹر شاستری کی کتاب مغربی بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں نصاب کے لئے منظور شدہ تھی۔ میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر آسوتوش چودھری کو ساری خط و کتابت کی نقل بھیجی اور ان سے درخواست کی کہ مذکورہ نصابی کتاب کی اس عبارت کے خلاف جس میں ٹیپو سلطان کے بارے میں غلط اور خلاف واقعہ بات کہی گئی ہے، مناسب کارروائی کی جائے۔ سر آشوتوش کا جلد ہی یہ جواب آ گیا کہ ڈاکٹر شاستری کی مذکورہ کتاب کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خودکشی کا وہی واقعہ ۱۹۷۲ء میں بھی یوپی میں جونیئر ہائی اسکول کی کلاسوں میں تاریخ کی نصابی کتابوں میں اسی طرح موجود تھا۔ اس سلسلے میں مہاتما گاندھی کا وہ تبصرہ قابلِ مطالعہ ہے جو ان کے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں ۲۳ر جنوری ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں صفحہ ۳۱ پر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

''میسور کے فتح علی (ٹیپو سلطان) کو بیرونی مورخوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا وہ انتہا پسند تھا جس نے اپنی ہندو رعایا پر مظالم کیے اور انہیں زبردستی مسلمان بنایا۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ ہندو رعایا کے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی خوشگوار تھے..... میسور ریاست کے محکمہ آثار قدیمہ (آرکیولوجی) کے پاس ایسے تیس خطوط ہیں جو ٹیپو سلطان نے شرنگیری مٹھ کے جگت گرو شنکر آچاریہ کو ۱۷۹۳ء میں لکھے تھے۔ ان میں ایک خط میں اس نے شنکر آچاریہ کے خط کی وصولی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے درخواست کی ہے وہ اس کی ساری دنیا کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لیے تپسیا اور دعا کریں۔ آخر میں اس نے شنکر آچاریہ سے درخواست کی ہے کہ وہ میسور لوٹ آئیں کیوں کہ کسی ملک میں اچھے لوگوں کی موجودگی سے بارش ہوتی ہے، فصل اچھی ہوتی اور خوشحالی آتی ہے''۔

یہ خط ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ینگ انڈیا میں آگے کہا گیا ہے:

''ٹیپو سلطان نے ہندو مندروں بالخصوص شری وینکٹ رمن، شرینواس اور شری رنگا ناتھ مندروں کو زمینوں اور دیگر اشیاء کی صورت میں بیش بہا تحفے دیے۔ بعض مندر اس کے محلات کے احاطے میں تھے جو اس کی کشادہ ذہنی اور رواداری کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں اور یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ وہ عظیم شہید جو کسی بھی اعتبار سے آزادی کی راہ کا حقیقی شہید قرار دیا جائے گا اپنی عبادت میں ہندو مندروں کی گھنٹیوں کی آواز سے

کوئی پریشانی محسوس نہیں کرتا تھا۔ ٹیپو نے آزادی کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دی اور دشمن کے سامنے سپر انداز ہونے کی تجویز کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا۔ جب ٹیپو کی لاش ان نامعلوم فوجیوں کی لاشوں میں پائی گئی تو دیکھا گیا کہ موت کے بعد بھی اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ تلوار جو آزادی کے حصول کا ذریعہ تھی۔ اس کے یہ تاریخی الفاظ آج بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ ''شیر کی ایک روزہ زندگی لومڑی کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے'' اس کی شان میں کہی گئی ایک نظم کا وہ بند بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 'خدایا جنگ کے خون برساتے ہوئے بادلوں کے نیچے مرجانا ننگ و عار اور ذلت کی زندگی جینے سے بہتر ہے'

اسی طرح جب میں الہ آباد میونسپلٹی کا چیئرمین تھا (۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک) تو میرے سامنے داخل خارج ایک ایک معاملہ لایا گیا۔ یہ تنازعہ سومیشور ناتھ مہا دیو مندر سے متعلق جائداد کے بارے میں تھا۔ مندر کے مہنت کے انتقال کے بعد اس جائداد کے دو دعویدار تھے۔ ایک دعویدار نے خاندان کے قبضے میں موجود کچھ دستاویزات پیش کیں۔ ان دستاویزات میں شہنشاہ اورنگ زیب کے فرمان بھی تھے۔ اورنگ زیب نے مندر کو جاگیر اور نقد عطیہ دیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ فرمان جعلی ہوں گے۔ بھلا اورنگ زیب جو مندر کو مسمار کرنے کے لئے مشہور ہے، ایک مندر کو یہ کہہ کر جاگیر دے سکتا ہے کہ ''یہ جاگیر پوجا اور بھوگ کیلئے دی جارہی ہے'' آخر اورنگ زیب بت پرستی سے کیسے اپنا ناطہ جوڑ سکتا تھا؟

مجھے یقین تھا کہ یہ دستاویزات جعلی ہیں۔ لیکن کسی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو سے رائے لے لوں جو عربی و فارسی کے زبردست عالم تھے۔ میں نے دستاویزات ان کے سامنے پیش کر کے ان کی رائے معلوم کی تو انہوں نے دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اورنگ زیب کے یہ فرمان اصلی اور حقیقی ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے منشی سے کہا کہ بنارس کے جنگم باڑی شیو مندر کی فائل لے آئے جس کے سلسلے میں کئی اپیلیں الہ آباد ہائی کورٹ میں ۱۵ سال سے زیر سماعت تھیں۔ اس مندر کے مہنت کے پاس بھی اورنگ زیب کے کئی فرمان تھے جن میں مندر کو جاگیر دی گئی تھی۔

اورنگ زیب کی یہ نئی تصویر تھی جو ان دستاویزات کو دیکھنے کے بعد میرے سامنے آئی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے مشورے کے مطابق میں نے ہندوستان کے متعدد اہم مندروں کے مہنتوں کے پاس خطوط بھیج کر ان سے درخواست کی کہ اگر ان کے پاس اورنگ زیب کے کچھ فرمان ہوں جن میں ان مندروں کو جاگیریں دی گئی ہوں تو وہ براہِ کرم ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں مجھے بھیج دیں۔ اب مجھے دوسری بار سخت حیرت سے دوچار ہونا پڑا جب اجین کے مہالیشور مندر، چتر کوٹ کے بالا جی مندر، گوہاٹی کے امانند مندر، شترونجائی کے جین مندر اور شمالی ہند میں پھیلے ہوئے دیگر عظیم مندروں اور گوردواروں سے متعلق جاگیروں کے لئے اورنگ زیب کے فرمانوں کی نقلیں مجھے موصول ہوئیں۔ یہ فرمان ۱۶۵۹ء سے ۱۶۸۵ء (۱۰۶۵ھ سے ۱۰۹۱ھ) کے درمیان جاری کیے گئے تھے۔

اگر چہ ہندوؤں اور ان کے مندروں کے تعلق سے اورنگ زیب کے فراخدلانہ رویّہ کی یہ چند مثالیں ہیں تاہم ان سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مورخین نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب پر مبنی ہے اور اس کی تصویر کا ایک ہی رخ پیش کیا

گیا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس میں ہزاروں مندر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر صحیح ڈھنگ سے تحقیقات کی جائیں تو مجھے یقین ہے کہ مزید بہت سی ایسی مثالیں مل جائیں گی جن سے اورنگ زیب کے غیر مسلمین کے ساتھ فیاضانہ سلوک کا پتہ چلے گا۔

اورنگ زیب کے فرمانوں کی تحقیقات کے سلسلے میں میرا رابطہ شری گیان چندر اور ڈاکٹر پی ایل گپتا سابق کیوریٹر پٹنہ میوزیم سے ہوا۔ یہ حضرات بھی اورنگ زیب کے بارے میں تاریخی اعتبار سے نہایت اہم تحقیق کر رہے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کچھ دیگر محققین بھی سچائی میں مصروف ہیں اور کافی بدنام اورنگ زیب کی تصویر صاف کرنے میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اورنگ زیب جسے متعصب مورخین نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی علامت قرار دے رکھا ہے اس کے بارے میں ان کے خیالات کیا ہیں۔ اس کے بارے میں شبلی جیسے تاریخ کے محقق شاعر کو کہنا پڑا:

''تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندوکش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا''

اورنگ زیب پر ہندو دشمنی کے الزام کے تعلق سے جس فرمان کو بہت اچھالا گیا ہے وہ ''فرمان بنارس'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فرمان بنارس کے محلّہ گوری کے ایک برہمن خاندان سے متعلق ہے ۱۹۰۵ء میں اسے گوپی اپادھیائے کے نواسے منگل پانڈے نے سٹی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے پہلی بار 'ایشیاٹک سوسائٹی' بنگال کے جرنل نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا۔ نتیجتاً وہ محققین کی توجہ کا باعث بنا۔ تب سے مورخین اکثر اس کا حوالہ دیتے آرہے ہیں اور وہ اس کی بنیاد پر اورنگ زیب پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ہندو مندروں کی تعمیر پر پابندی لگادی تھی جب کہ اس فرمان کی اصل اہمیت ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ جاتی ہے۔

یہ فرمان اورنگ زیب نے ۱۵/ جمادی الاول ۱۰۶۵ھ (۱۰مارچ ۱۶۵۹ء) کو بنارس کے مقامی حاکم کے نام ایک برہمن کی شکایت کے سلسلے میں جاری کیا تھا۔ وہ برہمن ایک مندر کا مہنت تھا اور کچھ لوگ اسے پریشان کر رہے تھے۔ فرمان میں کہا گیا ہے:

''ابوالحسن کو ہماری شاہی فراخدلی کا قائل رہتے ہوئے یہ جاننا چاہیے کہ ہماری فطری مہربانی اور فطری انصاف کے مطابق ہماری ساری انتھک جدوجہد اور منصفانہ ارادوں کا مقصد رفاہ عام کو فروغ دینا اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ طبقے کے حالات کو بہتر بنانا ہے۔ اپنے مقدس قانون کے مطابق ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ قدیم مندروں کو تباہ و برباد نہ کیا جائے البتہ نئے مندر نہ بنائے جائیں۔

عدل و انصاف پر مبنی ہمارے اس عہد میں یہ اطلاع ہمارے انتہائی معزز و مقدس دربار میں پہنچی ہے کہ کچھ لوگ بنارس شہر کے مضافات کے ہندو باشندوں اور مندروں کے برہمن پروہتوں کو ہراساں کر رہے ہیں اور ان کے معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں جب کہ قدیم مندرانہی کی دیکھ ریکھ میں ہیں۔ مزید برآں وہ چاہتے ہیں کہ وہ ان برہمنوں کو ان کے قدیم عہدوں سے بے دخل کر دیں۔ یہ دخل اندازی اس فرقہ کے لئے پریشانی کا باعث ہے۔

اس لئے یہ ہمارا فرمان ہے کہ ہمارا شاہی حکم پہنچتے ہی تم ہدایت جاری کر دو کہ کوئی بھی شخص غیر قانونی طور پر دخل اندازی نہ کرے اور ان مقامات کے برہمنوں اور دیگر ہندو باشندوں کو ہراساں نہ کرے تاکہ حسب سابق ان کا قبضہ برقرار رہے اور پوری دلجمعی کے ساتھ وہ ہماری مملکت خداداد کے لئے دعا

کرتے رہیں۔اس حکم کوفوراً نافذ کیا جائے۔

اس فرمان سے بالکل واضح ہے کہ اورنگ زیب نے نئے مندروں کی تعمیر کے خلاف کوئی نیا حکم جاری نہیں کیا بلکہ اس نے صرف پہلے سے جاری رواج کا حوالہ دیا اور اس رواج کی پابندی پر زور دیا۔ پہلے سے موجود مندروں کو تباہ کرنے کی اس نے سختی سے مخالفت کی۔اس فرمان سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ ہندو رعایا کو امن وسکون سے زندگی گزارنے کا موقع دینے کا خواہشمند تھا۔

یہ اپنے طرز کا ایک ہی فرمان نہیں ہے۔ بنارس میں ہی ایک اور فرمان ملتا ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اورنگ زیب واقعی اس کا بہت خواہاں تھا کہ ہندو امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔فرمان یہ ہے:

''رام نگر (بنارس) کے مہاراجہ دھیراج راجا رام سنگھ نے ہمارے دربار میں عرضی پیش کی ہے کہ ان کے والد نے دریائے گنگا کے کنارے اپنے مذہبی پیشوا بھگوت گوسائیں کی رہائش کے لئے ایک مکان بنوایا تھا۔اب کچھ لوگ گوسائیں کو ہراساں کررہے ہیں۔ چنانچہ شاہی فرمان جاری کیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی تمام موجودہ اور آنے والے افسران اس بات کا پورا خیال رکھیں کہ کوئی بھی شخص گوسائیں کو پریشاں وہراساں نہ کر سکے اور نہ ان کے معاملہ میں دخل اندازی کرے، تاکہ دلجمعی کے ساتھ ہماری مملکت خداداد کے استحکام کے لئے دعا کرتے رہیں۔ اس فرمان پر فوراً عمل کیا جائے'' (تاریخ ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ)

جنگمباڑی مٹھ کے مہنت کے پاس موجود کچھ فرامین سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کبھی اسے برداشت نہیں کرتا تھا کہ اس کی رعایا کے حقوق کسی طرح پامال کیے جائیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ وہ مجرموں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا۔اس طرح کے ایک فرمان میں جنگم فرقہ کے ماننے والوں (ایک مت کے لوگ) کی طرف سے بنارس کے ایک مسلمان باشندہ نذیر بیگ کے خلاف اورنگ زیب کے دربار میں پیش کی جانے والی شکایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر شاہی حکم جاری کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''بنارس صوبہ الہ آباد کے افسران کو اطلاع دی جاتی ہے کہ پرگنہ بنارس کے باشندوں ارجن مل اور جنگمیوں نے شکایت کی ہے کہ بنارس کے ایک باشندہ نذیر بیگ نے قصبہ بنارس میں ان کی پانچ حویلیوں پر قبضہ کرلیا ہے۔انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اگر شکایت صحیح پائی جائے اور جائداد کا حق ملکیت ثابت ہوجائے تو نذیر بیگ کو ان حویلیوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے تاکہ آئندہ جنگمیوں کو اپنی شکایت کے ازالہ کے لئے ہمارے دربار میں نہ آنا پڑے۔

اس فرمان پر ۱۱ رشعبان ۱۳ جلوس (۱۶۷۲ء) کی تاریخ درج ہے۔ اسی مٹھ کے پاس موجود ایک دوسرے فرمان میں جس پر یکم ربیع الاول ۱۰۷۸ھ کی تاریخ ہے، یہ ذکر ہے کہ اس زمین کا قبضہ جنگمیوں کو بحال کیا گیا۔فرمان اس طرح ہے:

''پرگنہ حویلی بنارس کے تمام موجودہ اور آنے والے جاگیر داروں اور کروڑیوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ شہنشاہ کے حکم سے ۷۸ ابیگھہ زمین جنگمیوں کو دی گئی۔ پرانے افسران نے اس کی تصدیق کی تھی اور اس وقت کے مالک پرگنہ کی مہر کے ساتھ یہ ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ زمین پر انہی کا حق ہے۔ چنانچہ شہنشاہ کی جان کے صدقے کے طور پر یہ زمین انہیں دے دی گئی۔ فصل خریف کے آغاز سے زمین پر ان کا قبضہ بحال کیا جائے اور پھر کسی طرح کی دخل اندازی نہ ہونے دی جائے تاکہ جنگمی لوگ اس کی آمدنی سے اپنی دیکھ ریکھ کرسکیں۔''

اس فرمان سے صرف یہی نہیں پتہ چلتا کہ انصاف اورنگ زیب کی فطرت میں رچا بسا تھا بلکہ یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس طرح کی جائدادوں کی تقسیم میں ہندو مذہبی خدمت گزاروں کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔ یہ ۱۷۸بیگھہ زمین جنگمیوں کو غالباً خود اورنگ زیب ہی نے بخشی تھی کیونکہ ایک دوسرے فرمان مورخہ ۵رمضان ۱۰۷۱ھ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ زمین مالگزاری سے آزاد ہے۔

اورنگ زیب نے ایک دوسرے فرمان (۱۰۹۸ھ) کے ذریعے ایک دوسرے ہندو مذہبی ادارے کو بھی جاگیر عطا کی، فرمان میں کہا گیا:

''بنارس میں دریائے گنگا کے کنارے بنی مادھوگھاٹ پر دو پلاٹ خالی ہیں۔ ایک مرکزی مسجد کے کنارے رام جیون گوسائیں کے گھر کے سامنے اور دوسرا اس سے پہلے۔ یہ پلاٹ بیت المال کی ملکیت ہیں۔ ہم نے یہ پلاٹ رام جیون گوسائیں اور ان کے لڑکے کو بطور ’انعام‘ بخش دیے تاکہ مذکورہ پلاٹوں پر برہمنوں اور فقیروں کے لیے رہائش گاہیں بنانے کے بعد وہ خدا کی عبادت اور ہماری مملکت خداداد کے استحکام کے لئے دعا کرنے میں مشغول ہوجائیں۔ ہمارے فرزندوں، وزیروں، امراء، اعلیٰ حکام، داروغہ موجودہ اور آنے والے کوتوالوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اس حکم کی بجا آوری کا خیال رکھیں اور مذکورہ پلاٹ، مذکورہ شخص اور اس کے ورثاء کے قبضے ہی میں رہنے دیں اور ان سے نہ کوئی مالگزاری یا ٹیکس لیا جائے اور نہ ہر سال نئی سند طالب کی جائے۔''

لگتا ہے اورنگ زیب کو اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کے احترام کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ ہمارے پاس اورنگ زیب کا ایک فرمان (مورخہ ۲رصفر ۹ جلوس ہے) ہے جو آسام کے شہر گوہاٹی کے اومانند مندر کے پجاری سودامن برہمن کے نام ہے۔ آسام کے ہندو راجاؤں کی طرف سے اس مندر اور اس کے پجاری کو ایک قطعۂ آراضی اور کچھ جنگلات کی آمدنی بطور جاگیر دی گئی تھی تاکہ بھوک کے اخراجات پورے کیے جاسکیں اور پجاری کی گزراوقات ہوسکے۔ جب اس صوبہ پر اورنگ زیب کا قبضہ ہوا تو اس نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے اس جاگیر کو برقرار رکھنے کا حکم دیا۔

ہندوؤں اور ان کے مذہب کے ساتھ اورنگ زیب کے روادانہ رویے کا مزید ثبوت اجین کے مہا کالیشور مندر پجاری سے ملتا ہے۔ یہ شیوجی کے اہم ترین مندروں میں سے ایک ہے جہاں دن رات چراغ جلایا جاتا ہے۔ اس کے لئے کافی دنوں سے چار سیر گھی روزانہ وہاں کی سرکار کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا اور پجاری کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ مغل دور میں بھی جاری رہا۔ اورنگ زیب نے بھی اس قدیم روایت کا احترام کیا۔ اس سلسلے میں پجاریوں کے پاس بدقسمتی سے کوئی فرمان تو موجود نہیں لیکن ایک حکم کی نقل ضرور ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں شہزادہ مراد بخش کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ (مورخہ ۵رشوال ۱۰۶۱ھ) کو یہ حکم شہنشاہ کی طرف سے شہزادہ نے مندر کے پجاری دیونارائن کی ایک درخواست پر جاری کیا تھا۔ حقیقت کی تصدیق کے بعد اس حکم میں کہا گیا ہے کہ مندر کی مشعل کے لئے چبوترہ کوتوال کے تحصیلدار چار سیر (اکبری) گھی روزانہ کے حساب سے مہیا کرائیں۔ اس کی نقل اصل حکمنامے کے جاری ہونے کے ۹۳ سال بعد (۱۱۵۳ھ) میں محمد سعد اللہ نے پھر جاری کی۔

عام طور پر مورخین اس کا بہت ذکر کرتے ہیں کہ احمد آباد میں ناگر سیٹھ کے بنوائے ہوئے چنتامنی مندر کو مسمار کیا گیا،

لیکن اس حقیقت کو چھپا جاتے ہیں کہ اسی اورنگ زیب نے اسی ناگر سیٹھ کے بنوائے ہوئے شترونجیا اور آبو مندروں کو کافی بڑی جاگیریں عطا کیں۔

بلاشبہ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے بنارس وشوناتھ مندر اور گولکنڈہ کی جامع مسجد کو ڈھا دینے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس کے اسباب کچھ اور ہی تھے۔ وشوناتھ مندر کا قصہ یہ ہے کہ جب اورنگ زیب بنگال جاتے ہوئے بنارس کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس کے قافلے میں شامل ہندو راجاؤں نے درخواست کی کہ وہاں ایک دن قافلہ ٹھہر جائے تاکہ ان کی رانیاں بنارس جاکر دریائے گنگا میں اشنان (غسل) کرلیں اور وشوناتھ جی کے مندر میں عقیدت کے پھول چڑھا آئیں۔ اورنگ زیب نے فوراً ہی یہ درخواست منظور کرلی اور قافلے کے پڑاؤ سے بنارس تک پانچ میل کے راستے پر فوجی دستے حفاظت کے لئے تعینات کر دیے گئے۔ رانیاں پالکیوں میں سوار ہوکر گئیں اور اشنان اور پوجا کے بعد واپس آگئیں۔ لیکن ایک رانی (کچھ کی مہارانی) واپس نہیں آئی تو ان کی بڑی تلاش ہوئی لیکن رانی کا پتہ نہیں چل سکا۔ جب اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوا اور اس نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسران کو تلاش کے لئے بھیجا۔ آخر میں ان افسران نے دیکھا کہ گنیش کی مورتی جو دیوار میں نصب ہے وہ ہلتی ہے۔ انہوں نے مورتی ہٹوا کر دیکھا تو تہ خانہ کا زینہ ملا گمشدہ رانی اسی میں پڑی رو رہی تھی۔ اس کی عزت بھی پامال کی گئی تھی اور زیورات بھی چھین لیے گئے تھے۔ یہ تہ خانہ وشوناتھ جی کی مورتی کے ٹھیک نیچے تھا۔ راجاؤں نے اس حرکت پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ چونکہ یہ بہت گھناؤنا جرم تھا اس لیے انہوں نے سخت ترین کارروائی کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبہ پر اورنگ زیب نے حکم دیا کہ چونکہ مقدس مقام کی حرمت پامال کی جاچکی ہے، اس لیے وشوناتھ جی کی مورتی کو کہیں اور لے جاکر نصب کر دیا جائے۔ مندر مسمار کرکے زمین بوس کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کرلیا جائے۔

ڈاکٹر پٹّا بھی سیتا رمیّا نے اپنی مشہور کتاب ''دی فیدرس اینڈ اسٹونس'' میں اس واقعہ کو دستاویزات کی بنیاد پر ثابت کیا ہے۔ پٹنہ میوزیم کے سابق کیوریٹر ڈاکٹر پی ایل گپتا نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔

گولکنڈہ کی جامع مسجد کا واقعہ ہے کہ وہاں کے حکمراں تانا شاہ ریاست کے محصولات کی وصولی کے بعد دہلی کو واجب رقم ادا نہیں کرتے تھے۔ چند ہی برسوں میں یہ رقم کروڑوں تک پہنچ گئی۔ تانا شاہ نے یہ خزانہ ایک جگہ زمین میں دفن کرکے اس پر مسجد تعمیر کرادی۔ جب اورنگ زیب کو اس کا پتہ چلا تو اس نے حکم دے دیا کہ یہ مسجد گرادی جائے۔ چنانچہ مدفون خزانہ نکال کر اسے مفاد عامہ کے کاموں میں استعمال کیا گیا۔

یہ دونوں مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اورنگ زیب انصاف کے معاملے میں مندر مسجد میں کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

'بدقسمتی سے عہدِ وسطی اور جدید دور کی ہندوستانی تاریخ کے واقعات اور کرداروں کو اس طرح توڑ مروڑ کر اور من گھڑت طریقے سے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ جھوٹ ہی خدائی ہدایت کی صداقت کی طرح تسلیم کیا جانے لگا اور ان لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جانے لگا جو حقیقت اور افسانہ اور جھوٹ اور سچ کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج بھی فرقہ پرست و مفاد پرست عناصر تاریخ کو توڑنے مروڑنے اور غلط رنگ دینے میں مشغول ہیں۔

☆☆☆

بحث وتحقیق

انکار حدیث کے بعد......؟

محمد فرید حبیب ندوی

دنیا کے نقشہ پر جو مذاہب موجود ہیں ان میں اسلام ہر اعتبار سے ممتاز ونمایاں حیثیت کا حامل ہے، اکثر مذاہب تحریف وتبدیلی کا شکار ہوکر اب اپنے اصلی حلیے اور قدیم لباس میں باقی نہیں رہے، بہت سے مذاہب ایسے بھی ہیں جن کی مذہبی حیثیت بجائے خود مشکوک ہے، مگر اسلام آج بھی ویسا ہی ہے جیسا اپنے نزول کے پہلے روز تھا، اس کے عقائد وہی، اعمال وہی، اخلاق وہی، معاشرتی اصول وہی، معاشی نظام وہی، سیاسی نظریات وہی، اس کی ہر چیز جوں کی توں ہے،

اسلام کا پورا نظام پانچ خانوں میں بٹا ہوا ہے، عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، معاملات ان پانچوں اجزاء سے اسلامی مذہب یا صحیح لفظوں میں دین اسلام تشکیل پاتا ہے۔

قرآن اسی اسلام کی ترجمانی کرتا اور اس کے پانچوں نظاموں کی اصولی وضاحت کرتا ہے، قرآن ایک عظیم فرد بشر محمد ﷺ کی ذات عالی صفات پر نازل کیا گیا، اس کی تبلیغ و توضیح اور تفسیر وتشریح کا آپ کے کاندھوں پر بوجھ ڈالا گیا، آپ کی حیثیت محض ایک ایلچی اور نرے قاصد کی نہیں تھی، بلکہ خدا کی طرف سے آپ ایک نمائندہ بن کر تشریف لائے تھے، جہاں ایک طرف آپ کی یہ ذمہ داری تھی یـــاایھـــا الـرسـول بـلـغ ما أنزل إليك من ربك (اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو-المائدۃ ۶۷) وہیں دوسری طرف یہ بھی آپ کا فرض منصبی تھا، وانـــزلـنـــا اليك الذكـر لتبين لـلـنـاس ما انزل إليهم (اوراب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جوان کے لئے اتاری گئی ہے-نحل ۴۴)

کچھ زمانے سے حدیث کے انکار کا ایک نیا سلسلہ چل پڑا ہے اور بڑے شد و مد سے مجموعۂ احادیث کا انکار کیا جاتا ہے، کچھ تو سرے سے حدیث کی حجیت وشرعی حیثیت کے ہی قائل نہیں جبکہ بعض دوسرے اس کی حفاظت وتدوین کی طرف سے شکوک وشبہات کا شکار ہیں، اس مضمون میں دراصل اسی طرح کے واہی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے،

حدیث کی حجیت وعدم حجیت کی بحث سے بالاتر ہوکر ایک عام امتی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ حدیث کے بغیر اس کی زندگی کتنی ادھوری ہے حدیث کا انکار کرکے اسے بیشتر تفصیلی تعلیمات و ہدایات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، اس کے ذہن میں یہ شبہ کلبلانے لگتا ہے کہ کیا واقعی اسلام قیامت تک کے

لئے ہے؟ رسول کی شانِ رسالت کے تعلق سے بھی دسیوں شبہات اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں، نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ حدیث کے بغیر تو کچھ بھی نہیں حتی کہ قرآن سمجھنے کے لئے بھی حدیث کے بغیر چارہ نہیں،

۱۔ قرآن کی تبلیغ اور اس کی توضیح وتشریح یہ دو الگ الگ آپ کی ذمہ داریاں تھیں، اور آپ نے دونوں ذمہ داریوں کو پوری طرح بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر نبھایا، آپ کا ایک امتی جس طرح آپ کے لائے ہوئے قرآن کو تسلیم کرتا، مانتا اور قبول کرتا ہے، اسی طرح آپ کی بیان کردہ تفسیر وتشریح قرآن کو بھی اپناتا اور سینہ سے لگاتا ہے، جس طرح تبلیغ قرآن کی شکل میں آپ نے اپنی جو ذمہ داری ادا کی اس کو ماننا واجب ہے اسی طرح تفسیر قرآن کی شکل میں جو دسری ذمہ داری ادا کی اس کو ماننا بھی واجب ہونا چاہیے بلکہ ہے، اس اعتبار سے آپ کی دو حیثیتیں تھیں، ایک حیثیت مبلغ قرآن کی، اور دوسری حیثیت مفسر قرآن کی، اور دونوں کو ماننا ایک امتی پر ضروری ہے، ایک کو تسلیم کرنا اور دوسری کو رد کرنا ایسا ہے جیسے آپ کی رسالت کو دو خانوں میں تقسیم کر کے ایک پر ایمان لایا جائے اور دوسری کو ٹھکرا دیا جائے۔

۲۔ اگر آپ کی بیان کردہ تفسیر قرآن (جس کا اصطلاحی نام حدیث ہے) کو اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ وہ ہم تک ان راویوں کے واسطے سے پہنچی ہے جن پر کوئی اعتماد نہیں، تو پھر قرآن کو بھی رد کر دینا چاہیے کیوں کہ وہ بھی تو ہم تک انہیں راویوں کے واسطے سے پہنچا ہے، ایک راوی کی بیان کردہ ایک چیز کو قبول کرنا اور اسی کی بیان کردہ دوسری چیز کو ٹھکرا دینا انصاف کی کس ترازو کی رو سے درست ہے؟ اور عقل کی کس میزان میں اس کی گنجائش ہے؟ مولانا وحید الدین خاں اس بات کو ذرا تفصیل سے اس طرح بیان کرتے ہیں

''کسی کا یہ کہنا کہ میں قرآن کو مانتا ہوں، مگر میں حدیث کو نہیں مانتا، یہ کوئی سادہ بات نہیں، یہ بظاہر قرآن کو مانتے ہوئے قرآن کا انکار کرنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن راویوں کے ذریعہ ہم کو حدیث رسول پہنچی ہے، انہیں راویوں کے ذریعہ ہم کو قرآن بھی ملا ہے، آج جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے وہ براہ راست ہم پر نہیں اترا وہ ٹھیک اسی سلسلہ روایت کے ذریعہ ہم کو ملا ہے جس سلسلۂ روایت کے ذریعے احادیث رسول ہم تک پہنچی ہیں، ایسی حالت میں ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا خالص غیر منطقی اور غیر علمی بات ہے، ایسے موقف کے لئے حقیقی طور پر کوئی جواز موجود نہیں''!

آگے لکھتے ہیں:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن کافی ہے، ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں ، وہ دراصل ایک غلط تقابل (Wrong comparison) کا شکار ہیں، جب وہ قرآن کا نام لیتے ہیں تو ان کے ذہن میں وہ قرآن ہوتا ہے جو آج چھپا ہوا مجلد صورت میں ان کے سامنے موجود ہے، اس کے برعکس، جب وہ حدیث کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت ان کے ذہن میں ابتدائی دور کی وہ تاریخ ہوتی ہے، جبکہ حدیث کا ذخیرہ منتشر صورت میں تھا اور اس کو مدون صورت میں جمع کیا گیا، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ کرتے ہیں کہ آج کے مطبوعہ قرآن کا تقابل، ماضی کے اس ذخیرہ حدیث سے

کرتے ہیں جبکہ حدیثیں منتشر طور پر غیر مطبوعہ صورت میں موجود تھیں، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں کا تقابل قبل از تدوین حالت اور بعداز تدوین حالت سے کیا جائے، یعنی مطبوعہ قرآن کا تقابل مطبوعہ حدیث سے اور اسی طرح غیر مطبوعہ قرآن کا تقابل غیر مطبوعہ حدیث سے۔.....اگر ایسے لوگ دوطرفہ مطالعہ کریں تو محسوس کریں گے کہ جس بنیاد پر وہ حدیث کے استناد کو رد کر رہے ہیں اگر وہ بنیاد علمی طور پر درست ہے تو اسی بنیاد پر انہیں قرآن کے استناد کو بھی رد کرنا پڑے گا۔انہیں یا تو دونوں کو لینا ہے، یا دونوں کو رد کرنا ہے، مگر وہ اس معاملہ میں تیسرا انتخاب (Third option) لئے ہوئے ہیں، اور اس طرح کے معاملے میں کبھی تیسرا انتخاب درست نہیں ہوتا''۔[۲]

۳۔ مجموعۂ احایث میں تین طرح کی حدیثیں پائی جاتی ہیں، متواتر، مشہور، اور خبر واحد، اگر کوئی متواتر کا انکار کرتا ہے تو قرآن کا بھی اسے انکار کرنا پڑے گا، کیونکہ قرآن اور حدیث متواتر دونوں ہی ثبوت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ہیں۔

مشہور کا درجہ متواتر سے کم اور خبر واحد سے اوپر ہے، رہی خبر واحد تو اس کی حجیت میں بھی کلام نہ ہونا چاہیے، کیونکہ محض یہ کہہ دینا کہ ایک دو راویوں کا اعتبار نہیں بہت بڑی جہالت ہے۔

دنیا کا نظام اسی اعتماد و بھروسہ پر قائم ہے، اگر کسی شخص کے متعلق یہ یقین و غالب گمان ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تو محض اس وجہ سے کہ کسی واقعہ کی خبر دینے والا وہ تنہا ہے اس کی بات رد کر دینے کی کوئی عقلی وجہ نہیں، اگر یہ اصول دنیا میں لاگو کر دیا جائے تو دنیا کا نظام چوپٹ ہو کر رہ جائے گا، اور پھر ہمیں گواہی اور شہادت کا سلسلہ ختم کرنا پڑے گا، کیوں کہ زیادہ تر دو لوگوں کی گواہی کسی بھی معاملہ میں فیصلہ کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے، اور قرآن نے بھی صاف الفاظ میں اس کی صراحت کی ہے واستشهدوا شهيدين من رجالكم الخ اور يايها الذين اٰمنو شهادة بينكم إذا حضر احدكم الموت حين الوصية اثنان ذوا عدل منكم الخ

وہمی دماغ کا اس دنیا میں کوئی علاج نہیں، ہر چیز میں ''اگر مگر'' یا ''ہوسکتا ہے'' کرنا بیوقوفی اور شکی دماغ کی سب سے بڑی دلیل ہے، جس کی کوئی دوا اس عالم آب وگل میں موجود نہیں، اگر دنیا میں یہ اصول چل پڑے تو پھر منکرین حدیث اپنا نسب بھی ثابت نہیں کر پائیں گے، کیوں کہ ان کی ہر دلیل پر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہوسکتا ہے تمہارے والد کوئی اور ہوں، تمہاری پیدائش کے وقت کچھ ادھر سے ادھر ہو گیا ہو،

لہذا کسی حدیث کو محض اس بنیاد پر رد کر دینا کہ اس کا راوی ایک یا دو ہیں بالکل غیر عقلی بات ہے، دنیا کا نظام ہی اسی پر قائم ہے، ورنہ زندگی ہی اجیرن ہو جائے گی، کسی کی موت کی خبر سن کر کیا اس وجہ سے رد کرنے کا کوئی جواز ہے کہ خبر دینے والا ایک یا دو ہیں، ہاں یہ ہونا چاہیے کہ اس خبر دینے والے (راوی) کی امانت و راست بازی کو جانچ اور پرکھ لیا جائے، اور حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے تمام رواۃ پر جرح و تعدیل کی گئی ہے، اور جو ثقاہت و عدالت سے متصف پائے گئے ہیں انہی کی روایات کو صحیح یا حسن کا درجہ ملا ہے، ان کے علاوہ کی روایات رد کر دی گئی ہیں۔

۴۔ حدیث کے تعلق سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ وہ ایک صدی بعد مدون کی گئیں، اول تو یہ بات ہی غلط ہے، کیونکہ حدیثوں کا بڑا حصہ عہد صحابہ میں ہی مدون کرلیا گیا تھا، کتب تاریخ میں مختلف صحابہ کے لکھے ہوئے احادیث کے نسخے موجود ہیں، پھر دوسرے کسی خبر وروایت کو محض اس بنیاد پر ردکردینا کہ وہ مکتوبہ شکل میں نہیں ہے کہاں کی دانش مندی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں واقعات وروایات کی منتقلی اوران کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، ایک زمانہ والے دوسرے زمانہ والوں کی روایات کو اس وجہ سے ردکرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے کہ ان کے زمانے میں جس ذریعہ سے ان کو محفوظ کیا گیا ہمارے زمانے میں وہ طریقہ زیادہ محتاط نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہمارے دور میں اخبار وروایات کی حفاظت کا بڑا مدار کتابت پر ہے اس زمانہ میں حفظ پر تھا، جس زمانہ کی ہم بات کررہے ہیں اس زمانے کے لوگوں کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اس سلسلہ میں تفصیل کے لئے ''تدوین حدیث'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔[۳]

ہمارا اسلام محض چند عقائد یا رسموں کا کوئی مجموعہ نہیں، بلکہ وہ معاشرتی اور تمدنی، سماجی اور سیاسی تمام مسائل کا دل پیش کرتا ہے، اوراس کی تفصیل حدیث کے ذخیرہ سے ہی ہمیں مل سکتی ہے نہ کہ قرآن میں تو اجمالی اور اصولی باتیں ہیں، حدیث کی ہمیں قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے، ہر زمانہ کی گمراہی اور فتنہ پردازیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے بھی ہمیں حدیث کا سہارا لینا پڑتا ہے، ہر دور کے گمراہ کن نظریات و افکار کو سمجھنے کے لئے بھی حدیث کا ذخیرہ نہ ہوتو ہم تاریکیوں میں بھٹکتے رہ جائیں گے، حدیث ہمیں علمی سیرابی عطا کرتی ہے، حدیث سے بہت بڑا خلا پر ہوتا ہے، حدیث ہماری ضرورت ہے، ذخیرہ حدیث کی موجودگی ہمارے لئے بڑے فخر واعتماد کی چیز ہے، ہم ایک غیر مسلم شخص سے اپنے اسلام کی جامعیت اس طور پر بیان کرسکتے ہیں کہ ہمارا مذہب ہمیں ہر چیز سکھاتا ہے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اصول و آداب بھی، معاشرت ورہن سہن کے ڈھنگ بھی اور معاملات واخلاق کے طور طریقے بھی، حدیث کے ذخیرہ کی موجودگی کی وجہ سے ہم ایک غیر مسلم کو پورے فخر، پوری قوت، پورے اعتماد اور کامل بھروسہ کے ساتھ وہی جواب دے سکتے ہیں جو حضرت سلمان فارسی نے ایک یہودی کو دیا تھا، جس کا ذکر اس حدیث میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی سے کسی شخص نے اعتراضاً کہا کہ نبی تو تم کو ہر ہر چیز سکھاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ہاں، ہمارا نبی ہمیں ہر چیز کا سلیقہ سکھاتا ہے حتی کہ استنجاء کا بھی طریقہ وہ ہمیں بتاتا ہے۔[۴]

اگر ہم سے حدیث کا یہ ذخیرہ چھین لیا جائے تو ہم اسلام کی جامعیت اس شان سے بیان نہیں کرسکیں گے کہ ایسا کرنا ہمارے اعتماد کو ختم کرنا ہے، آج حدیثیں موجود ہیں تو ہم دنیا کے ہر پلیٹ فارم سے یہ اعلان کرسکتے ہیں اور برملا اس کا دعوی کرسکتے ہیں کہ اے لوگو: ہمارے نبی کی ایک ایک ادا محفوظ ہے، ان کی ایک ایک نقل وحرکت ہمارے سامنے ہے، ان کی رات بھی دن کے اجالے کی طرح روشن ہے، ان کا سفر بھی حضر کی طرح واضح ہے، اب اگر ہمارے پاس یہ ذخیرہ موجود نہ رہے تو ہمارے اور دوسرے لوگوں کے رسولوں میں کیا فرق رہ

جائے گا؟ دوسرے نظاموں اور قوانین کی طرح اسلام میں بھی تشنگی باقی رہے گی، پھر ہم مکمل طرز حیات کہاں سے لیں گے؟ کھانے پینے، سونے جاگنے اور بیت الخلاء میں آنے جانے کے اصول آداب کس سے ادھار لیں گے؟

۶۔ قرآن پاک میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جو تشریح طلب ہیں، ان کا ترجمہ تو عربی جاننے والا ایک شخص سمجھ سکتا ہے مگر ان کا اصلی مفہوم و متعین مراد محض زبان دانی سے نہیں سمجھی جاسکتی، اب اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہر انسان اور قرآن کے ہر پڑھنے والے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، وہ اپنی عقل، اپنے فہم، اپنے ذوق کے اعتبار سے اس کی جو تفسیر کرے یا اس کا جو معنی مراد لے اس میں اس کو آزاد سمجھا جائے اور اختیار کلی دے دیا جائے، اس صورت میں قرآن کا کیا ہوگا؟ قرآن پھر ایک کتاب ہدایت کے بجائے ایک کھلونا بن جائے گا، ایک ہی آیت سے مختلف لوگ اپنے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے غلط سلط مسائل اخذ کریں گے اور اس طرح قرآن بجائے اس کے کہ لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بن سکے ان کی گمراہی کا سبب بن جائے گا، اس کی بہت سی آیات ہیں جو حدیث کی مدد کے بغیر پوری طرح ہم نہیں سمجھ سکتے، مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

الذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم (جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے) کیا ہر شخص جس کے پاس ذرا بھی سونا چاندی ہے اسے بھی یہ وعید شامل ہے؟

وللّٰه علی الناس حج البیت من استطاع إلیه سبیلاً (جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں ان پر اللہ کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے) لہذا اگر ہر سال استطاعت ہے تو کیا ہر سال حج فرض ہوگا؟ والسارق والسارقة فاقطعوا أیدیهما (چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو) بتایئے کہ کتنا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ اس سلسلہ میں کتنی آراء سامنے آئیں گی؟

ایک دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کی وہ تفسیر و تشریح جو رسول اللہ سے مروی ہے اس پر اعتماد کیا جائے، کیوں کہ قرآن کے سب سے بڑے رمز شناس اور اس کی مراد و گہرائی تک سب سے زیادہ پہنچنے والے آپ ہی تھے، ان دونوں صورتوں میں سے کون سی صورت زیادہ معتبر و قابل اعتماد ہے اور کس میں زیادہ احتیاط ہے؟ یقیناً دوسری میں۔ اسی بات کی طرف حضور پاک علیہ السلام نے اشارہ بھی فرمایا ہے، من قال فی القرآن برأیه فأصاب فقد أخطأ ۵

۷۔ قرآن میں بہت سے احکام مجملاً آئے ہیں، ان کی کوئی تفصیل قرآن میں موجود نہیں ہے، مثلاً نماز جو دین اسلام کا بنیادی ستون ہے اس کے بارے میں قرآن میں کہیں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ کتنے اوقات کی نماز فرض ہے، کونسا وقت کب سے کب تک ہے، ہر نماز میں کتنی رکعات ہیں، یہی حال زکوۃ کا بھی ہے، کہ اس کا نصاب اور اس پر واجب ہونے والی رقم اور تعداد کا کوئی ذکر نہیں۔

جو لوگ اس سلسلہ میں حدیث کو نہیں مانتے اور حدیث کا سہارا لئے بنا ہی کام چلانے کی ناممکن کوشش کرتے ہیں وہ یہ

کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ حاکم کی صوابدید پر ہے، وہ جو چاہے متعین کرسکتا ہے، لیکن پہلی بات تو یہ کہ جہاں حاکم ہی نہ ہو، جہاں اسلامی خلیفہ و امیر ہی نہ ہو وہاں اس کے حل کی کیا صورت ہوگی؟ دوسرے یہ بھی کہ اگر اس کو حاکم کے حوالے کر دیا جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہر حاکم اسلامی سوچ ہی رکھتا ہوگا، کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک مسلم حاکم غیر اسلامی فکر وعمل میں گرفتار ہو، اس کے نتیجہ میں کیا کچھ ہوسکتا ہے ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

پھر ایک بات یہ بھی کہ اگر یہ فیصلہ حاکم کی صوابدید پر ہی چھوڑ دیا جائے تو ہم سب جانتے ہیں کہ آئے دن حاکم بدلتے رہتے ہیں، حاکم کی تبدیلی نماز کی ہیئت اور زکوۃ کی صورت میں کیا کچھ تبدیلی کرے گی کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟

اور اگر اس کا فیصلہ انفرادی آراء پر چھوڑ دیا جائے تب تو نماز وزکوۃ کی جو درگت بنے گی اس کا اندازہ ناممکن ہے، بہت سے دن میں ایک نماز کے قائل ہوں گے، کچھ چند سجدوں پر اکتفا کریں گے اور کچھ تھوڑی دیر قیام کو نماز کا نام دیں گے، یہی حال زکوۃ کا بھی ہوگا، کہ کچھ پوری زندگی میں ایک ہی بار زکوۃ کی ادائیگی کے قائل ہوں گے، بہت سے چند روپے نکال کر سمجھیں گے کہ ہم بری الذمہ ہوگئے۔

اسی بات کو ایک صحابی نے بڑے پیارے انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے: مستدرک حاکم (۱۰۹/۱) میں حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہمارے نبی کی حدیثیں بیان کررہے تھے، اتنے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ: اے ابو نجید (عمران بن حصین کی کنیت) ہم کو قرآن سے بیان کیجئے، تو آپ نے اس سے فرمایا: تم اور تمہارے ساتھی قرآن پڑھتے ہو، کیا تم مجھے قرآن سے نماز کی کیفیت، اور اس کی صفات بتا سکتے ہو؟ اسی طرح اموال زکوۃ سونا چاندی، اونٹ گائے وغیرہ کے نصاب اور ان کی تفصیلات قرآن سے بتا سکتے ہو؟[۶]

۸۔ قرآن میں جا بجا خدا تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے، اسی طرح اپنے رسول کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں خدا نے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو ذکر نہ کیا ہو مگر ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں صرف اطاعت رسول کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، جیسے واقیموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ وأطیعوا الرسول لعلکم ترحمون، اور وإن تطیعوہ تھتدوا، اور یومیذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لوتسوی بھم الأرض، اور ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی الخ...[۷]

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر رسول کی اطاعت قرآن کو جاننے ہی میں منحصر ہے، تو اس کو الگ سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت و وجہ ہوسکتی ہے؟ اطاعت رسول کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اگر رسول قرآن سے الگ بھی کوئی حکم دیں تو بھی ان کی اطاعت کرو، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فلا و ربك لا یؤمنون حتی یحکمون فیما شجر بینھم الخ... (نہیں، اے محمد، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات

میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کرلیں- النساء ۶۵) یعنی جب تک یہ لوگ آپ کو اپنے اختلافی مسائل و جھگڑوں میں حکم نہیں بنائیں گے مومن نہیں ہو سکتے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکم کی حیثیت سے رسول جو فیصلہ کریں گے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن میں موجود ہو، اگر کوئی اس طرح کا مسئلہ ہے جس کا جواب قرآن میں نہ ہو اور رسول اپنی طرف سے اس کا تصفیہ کردیں تو کیا اس کا ماننا اس آیت کی رو سے واجب اور اس کا نہ ماننا انسان کو دائرہ ایمان سے خارج کردینے کا سبب نہیں ہے؟ اور اگر ایسا ہے بلکہ یقیناً ایسا ہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہی فیصلوں اور (اس جیسے دوسرے ارشادات کے) مجموعہ کو جن کا اصطلاحی نام حدیث ہے رد کردیا جائے، کیا یہ عمل اس آیت کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں انکار قرآن تک نہیں پہنچتا؟

۹۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله (ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے- النساء ۶۴) یہاں رسول نبی کو بھی شامل ہے، گویا رسول اور نبی کی بعثت ہی اس لئے ہوتی تھی کہ ان کی ہر بات مانی جائے، اگر مسئلہ محض کتاب خداوندی وصحیفۂ آسمانی کو ماننے کا ہوتا تو پھر رسول کی بعثت کا فائدہ ہی کیا؟

دوسری بات یہ کہ قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني اتباع میں پیچھے چلنے اور نقش قدم کی پیروی کرنے کا مفہوم ہے، اطاعت کا تعلق عموماً قول سے ہوتا ہے اور اتباع کا عمل سے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول پاک کے کون کون سے اعمال بیان کئے گئے ہیں جن کی اتباع کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے؟ کیا رسول کے سونے جاگنے، چلنے پھرنے، ہنسنے مسکرانے، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب واعمال کا ذکر قرآن سے پیش کیا جاسکتا ہے؟ نہیں تو پھر ان اعمال کی اتباع کیسے ہوگی؟ ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی میں آپ کو دیکھ کر اور آپ کے بعد جن احادیث میں یہ اعمال نقل کے گئے ہیں انہیں مان کر- اس کے علاوہ اور کوئی صورت بھی ہوسکتی ہے کیا؟

۱۰۔ منکرین حدیث ایک غلط استدلال یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمودات وارشادات اور آپ کی بیان کردہ تشریح وتفسیر اور آپ کی طرف سے کئے گئے فیصلے صرف ان لوگوں کے لئے حجت تھے جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے، یہ استدلال تو اتنا غیر علمی اور جاہلانہ ہے کہ اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں، البتہ بنیادی طور پر ایک دو باتیں عرض ہیں:

پہلی یہ کہ اس غلط استدلال کو ماننے کے نتیجہ میں آپ کی رسالت ایک خاص وقت تک کے لئے محدود ہوجاتی ہے، کیوں کہ اگر آپ اپنے ہمعصر مومنین کے لئے رسول تھے اور آپ کی باتیں ان کے لئے واجب التعمیل تھیں پھر جب کہ آپ ہمارے بھی رسول ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آپ کی باتیں ہمارے لئے واجب التعمیل نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی

رسالت ہمارے زمانہ تک محیط وممتد نہیں، کیا اس سے انکار رسالت لازم نہیں آتا؟

یـایهـا الذین آمنوا سے مراد کیا صرف دور نبوت کے اہل ایمان تھے۔

پھر جن آیات میں رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، دور نبوت کے بعد ان کو قرآن میں باقی رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ جب ہم پر ان کی اطاعت واجب ہی نہیں تو پھر ان آیات کی تلاوت کا کیا حاصل جن میں اطاعت رسول کا حکم مذکور ہے؟ ان کو قرآن سے نکالا کیوں نہیں جاتا؟ یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ آیات بے فائدہ ہیں، ان کے ذکر کا کوئی مقصد نہیں، اگر یہ مانا جائے تو لازم آئے گا کہ قرآن کی کچھ آیات بے مقصد و بے فائدہ بھی ہیں، جبکہ قرآن اپنا تعارف خود اس طرح کراتا ہے لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه جس طرح باطل کا لفظ یہاں غیر حق کو شامل ہے اسی طرح بے فائدہ ولا حاصل بات کو بھی۔

پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ تو قرآن بھی اس خاص وقت کے ہونا چاہیے، دونوں میں تفریق کی کیا دلیل ہے، اگر وہ آیات دلیل کے طور پر پیش کی جائیں جن میں اتباع قرآن کا حکم ہے جیسے اتبعوا ما أنزل إليكم من ربكم تو پھر قرآن ہی میں وہ آیات بھی تو ہیں جن میں اتباع رسول کا حکم دیا گیا ہے مثلا قل إن كنتم تحبون الله فاتبعونی

دونوں طرح کی آیات میں تفریق کے کیا معنی اور کس دلیل کی بنیاد پر؟

بلکہ اس بات کو بھی کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ قرآن خدائی کتاب ہے، کیونکہ یہ خبر خود رسول نے دی ہے اور رسول کے ارشادات مفکرین حدیث کے لئے حجت نہیں۔ اس سے بڑی بے وقوفی بھی ہوسکتی ہے کیا؟ تلك عشرة كاملة

اس فتنہ کے پس پردہ بہت سے اسباب ومحرکات اور عوامل ہیں جن کو انشاء اللہ ذرا تفصیل سے اگلی قسط میں بیان کیا جائے گا۔

.....

حواشی:

(۱) الرسالۃ: وحید الدین خان ص۲

(۲) أیضاً ص۵-۶

(۳) تدوین حدیث: مناظر احسن گیلانی

(۴) ترمذی: أبـواب الـطهـارة بـاب كراهية الاستنجاء باليمين ۱۰/۱

(۵) مشکوۃ: كتـاب الـعـلـم، الفصل الثانی ۳۵/۱

(۶) حدیث اور فہم حدیث: عبداللہ معروفی ص ۶۶-۶۷

(۷) حجیت حدیث: تقی عثمانی ص۲۰

☆☆☆

اسلامی تعلیمات (آخری قسط)

مشترکہ خاندانی نظام غور وفکر کے چند پہلو

محمد قمر الزماں ندوی، مدرسہ نور الاسلام کنڈہ، پرتاپگڈھ

نوٹ: فاضل مقالہ نگار نے بقدر استطاعت اس حساس موضوع پر تفصیلات رقم کیں اور آخر میں اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کیا، مضمون کا آخری حصہ قدرے اہم ہونے کے ساتھ اس لیے تشنہ ہے کہ اس موضوع پر غالباً ابھی اہل حل وعقد نے سوچا نہیں، راقم کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام (Combined family System) کے مقابلہ جداگانہ خاندانی نظام ہی (Seprate family System) ہی اسلام کی فطرت سے زیادہ قریب اور مطلوبہ نظام ہے، لیکن اس کا خاکہ مرتب کرنا ہندوستانی بلکہ برصغیر کی اقتصادی ومعاشرتی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر اور اس حساس مسئلہ کا حل پیش کرنا انتہائی اہم ہے، جہاں آئے دن حق تلفیوں اور ناانصافیوں کے واقعات ہوتے ہیں اور شاید عدالتیں ایک ہی خاندان کے افراد کے تقسیم میراث کے مقدمات سے پٹی پڑی ہیں، اس نظام میں کسی کا فائدہ اور کسی کا نقصان لازمی سی بات ہے، لیکن اخوت وصلہ رحمی اور محبت وجذبۂ تعاون سے عاری جداگانہ نظام بھی اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام نہیں، البتہ واقعہ یہ ہے کہ جب ان جذبات کو باقی رکھنا ممکن ہوتا ہے اور اس تربیت کا موقع ہوتا ہے کہ الگ رکھ کر بھائی کو بھائی کی قدر و قیمت سے آشنا کیا جائے اور داخلی معاملات میں علیحدگی کے باوجود خارجی امور میں اجتماعیت کے اظہار کا راز سمجھایا جائے اور ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ زندگی کی حلاوتوں کو حاصل کرنے کا راز بتایا جائے، تب عموماً والدین توجہ نہیں دیتے، پھر جب ایک مدت کے بعد (عام طور پر غیض وغضب اور نفرت وعداوت کے جذبات سے مغلوب ہوکر) تقسیم عمل میں آتی ہے تو مقدمات کی بھرمار ہوتی ہے، اس طرح کے مقدمات، تنازعات اور نفرتیں خود ہمارے مشاہدے میں بے شمار ہیں،

ہمیں فاضل مقالہ نگار اور دیگر اصحاب فکر ونظر سے قوی امید ہے کہ وہ اس حساس مسئلہ پر کوئی قطعی اور فیصلہ کن لائحہ عمل پیش کریں گے، کیا ہی خوب ہو کہ برصغیر کے اقتصادی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو سامنے رکھ کر کوئی ایسا معتدل خاندانی نظام مرتب کیا جائے جسمیں اگر علیحدہ گھر کی فراہمی دشوار ہو تو ایک گھر میں رہ کر بھی بہت سے ان مفسدات سے بچا جاسکے جو بعد میں مسلسل اور طویل تنازعات کا سبب بنتے ہیں اور محبتوں کو نفرتوں میں بدل کر ہمیشہ کیلئے باقی ماندہ زندگی اجیرن کردیتے ہیں، یا اس نظام میں پناہ لینے پر مجبور کردیتے ہیں جسمیں بھائی کو بھائی اور اولاد کو والدین کے فقر وفاقہ اور مصیبت وغم سے کوئی مطلب نہیں رہ جاتا، ہمیں امید ہے کہ علماء اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل پیش کرنے کی مبارک کوشش کریں گے، یہ ملحوظ رہے کہ راقم کی نظر میں آج کے مروجہ جداگانہ نظام کے سبب بالخصوص والدین بہت سے ان مسائل سے دوچار ہیں جن سے شرعاً ان کو تعاون ملنا چاہیے، پھر اخوت والفت اور باہمی تعاون کی اسلامی تعلیمات واقدار سے دوری اور آپسی تعاون وتعلقات میں بے اعتنائی قدرے دیندار گھرانوں کا بھی حصہ ہے (مدیر)

مشترکہ خاندان کا فائدہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتماعیت ایک قابل رشک چیز ہے اور اسلام نے اس پر بہت زور دیا ہے، مشترکہ خاندانی نظام اجتماعیت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور یہ اس نظام کا یقیناً مفید پہلو ہے، مشترک خاندان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر پورا خاندان یکجا ہو تو افرادی قوت کی کمی کا احساس نہیں ہوتا، یکسوئی، اتحاد اور یگانت کے نتیجہ میں قوت وشوکت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذرائعا ور وسائل میں کشادگی و وسعت پیدا ہوتی ہے۔ آگے

بڑھنے اور ترقی کرنے کے امکانات نسبتا زیادہ ہو سکتے ہیں، خاندان کی ایک اکائی دوسروں کے لئے تقویت ونوانائی کا سبب بنتی ہے۔ بچوں کی نشو ونما اور تربیت کے لئے بہت سے شفیق دست وبازو مہیا ہوتے ہیں۔تنہائی وکسمپرسی کا احساس نہیں ہوتا۔ خاندان اور اس کی نئی پود کو متوازن اٹھان حاصل ہوتی ہے، بحیثیت مجموعی خوش حالی، عزت، قوت، و جاہت اور رسوخ مشترک خاندان کے ذریعہ آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

مشترکہ خاندان میں بیٹوں بھائیوں کی یکجا محنت اور مشترکہ جدو جہد خاندان کو معاشی استحکام عطا کرتی ہے، خاندانی روایات کو برقرار رکھنے میں یہ نظام معاون بنتا ہے، بچے بڑے سب مل کر رہتے، سب دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، مل کر رہنے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام کے حامیوں کے دلائل

مشترکہ خاندانی نظام کے حامی یہ کہتے ہیں، یہ خاندانی نظام ایک معہود ومعروف چیز ہے، اسے غیر شرعی اور نامعقول اور ناقابل قبول نہیں کہا جاسکتا اور ایک غریب باپ کو اس امر کا مکلّف نہیں بنایا جایا سکتا کہ وہ ہر لڑکے کی شادی سے پہلے الگ مکان مہیا کرائے اور شادی کر کے اسے الگ مکان میں شفٹ کردے۔

مولانا مفتی محبوب علی وجیہی مشترکہ خاندانی نظام کی وکالت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، حضور ﷺ نے اجتماعی مفاد کے تحفظ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کے لئے انفرادی مفاد کو نظر انداز کیا ہے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، اسی طرح آپؐ نے اجتماعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے حطیم کو خانہ کعبہ میں شامل نہیں کیا، ایسے ہی اجتماعی حالات کے پیش نظر قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ بنا کر رکھنے سے منع کیا تھا، تاکہ غرباء تک زائد سے زائد گوشت پہنچے اور وہ محروم نہ رہیں، پھر جب آپؐ سے شکایت کی گئی اور مختلف قسم کی ضرورتیں بیان ہوئیں تو آپؐ نے ذخیرہ کر کے رکھنے کی اجازت دے دی۔

حضور ﷺ نے منافقین کے قتل کرنے سے منع کر دیا تھا تاکہ لوگوں کی نفرت اور یہ کہنے کا سبب نہ بنے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں حالانکہ وہ طرح طرح کے فتنہ وفساد پھیلاتے رہتے تھے لیکن ''مصلحة الاسلام أعظم من مصلحة القتل '' کے تحت منافقین کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، پھر جب یہ اندیشہ جاتا رہا اور اسلام کے غلبہ سے تالیف قلب وغیرہ کی مصلحت پہلی جیسی نہیں رہی تو یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، لہذا ان واقعات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے ذاتی اور انفرادی مفادات کو نظر انداز کر کے اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ کیونکہ انفرادی اور شخصی مفاد کے مقابلہ اجتماعی مفاد اہم ہے، پس مشترکہ خاندانی نظام سے بوڑھے ماں باپ چھوٹے بہن بھائی اور یتیم و بیواؤں وغیرہ کو سہارا زائد مل سکتا ہے اور ایسے بے سہارا لوگوں کی کفالت جو اس کے زیر نگرانی ہوں واجب ہے، رہا یہ مسئلہ کہ مشترکہ خاندانی نظام سے باہمی نزاع پیدا ہوتا ہے اور پردے کا اہتمام دشوار ہوجاتا ہے، تو اس معاملہ میں انسان کو اپنی حکمت عملی اور سیاست دینی سے کام لینا چاہیے اور گھر کے ماحول پر سخت نظر رکھنا چاہیے، نہ کہ گھر کے خراب ماحول سے متأثر ہوکر بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں

کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہیے۔ ہاں اگر گھر کے تمام لوگوں کو ایک ساتھ رکھنے میں قوی جھگڑے کا امکان ہو تو پھر اسے چاہیے کہ ایک کالونی یا ایک محلّہ میں رہے اور قریب رہ کر ماں باپ اور دیگر لوگوں کی اپنے ذمہ میں پرورش کرے اور ان کی نگرانی کرے لیکن بالکل علیحدہ چھوڑ کر ماں باپ وغیرہ سے دور رہنا درست نہیں ہے''۔(مشترکہ خاندانی نظام صفحہ ۳۱۳-۳۱۴)

مشترکہ خاندانی نظام کے محرکات

خاکسار کی رائے میں مشترکہ خاندانی نظام کے اصلا دو محرکات ہیں (۱) بالا دستی کی خواہش (۲) جائداد کا ارتکاز، یعنی اس نظام کے پیچھے یہ ذہنیت کارفرما ہے کہ جس خاندان کے تمام افراد ایک ساتھ رہیں گے، تو اس خاندان کو اپنے ماحول میں تسلط اور بالا دستی حاصل ہوگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ پورے خاندان کی جائداد اکٹھا رہے گی جس سے گھر کی مالی حیثیت مستحکم رہے گی، گھر بٹیں گے تو جائداد تقسیم ہوگی جس کے نتیجہ میں خاندان مالی حیثیت سے کمزور ہو جائے گا، دراصل یہ نظام یہودی، مذہب ہندو طرز معاشرت اور اسلام سے پہلے عرب کے جاہلی نظام کا پسندیدہ طرز معاشرت رہا ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام کی خامیاں اور خرابیاں

یہ حقیقت ہے کہ عمومی حالت میں اسلام کا پسندیدہ خاندانی نظام جداگانہ خاندانی نظام ہے، اور مشترکہ خاندانی نظام کو اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام نہیں قرار دیا جا سکتا، کیوں کہ مشترکہ نظام کے معائب و نقائص کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہ نظام صرف نفسیاتی، دینی، معاشرتی اور معاشی و مالیاتی پہلوؤں ہی کے اعتبار سے نا پسندیدہ نہیں ہے بلکہ مشترکہ خاندانی نظام بسا اوقات جنسی عدم تسکین کا بھی سبب بنتا ہے ذیل میں اس نظام کے معائب و نقائص کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کریں گے یہ تفصیلات زیادہ تر مولانا سلطان احمد اصلاحی کی کتاب ''مشترکہ خاندانی نظام'' اور مشہور صاحب قلم مولانا اختر امام عادل کے مضمون ''مشترکہ خاندانی نظام-شرعی نقطۂ نظر'' سے لی گئی ہیں نیز اس موضوع پر فقہ اکیڈمی انڈیا نے جو مقالات شائع کئے ہیں ان سے استفادہ کیا گیا ہے۔

معاملات کی خرابی

اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کا مکلّف بناتا ہے کہ وہ آپس کے معاملات میں صفائی رکھیں اور اسے ہر طرح کے جھگڑے سے پاک رکھیں، قرآن اور احادیث نبویہ میں اسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں مالیاتی پہلو سے بے ضابطگی ایک امر واقعہ ہے، ہر شخص کو ایک متعین رقم یا پوری کمائی جھونک دینے کا پابند بنانے میں خوش دلی کا حصہ کم اور معاشرتی جبر اور دباؤ کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ نیز ہر شخص کے لئے کھانے پینے میں ایک متعین نظام کی پابندی مشکل اور دشوار معاملہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چوری چھپے اپنے من پسند کھانوں پھلوں اور لباس وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے اس ماحول میں چوری چکاری جھوٹ فریب اور دھوکہ دہی کی خصلت و عادت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے اور ایک طرح ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

وراثت اور موروثی جائداد کا تنازعہ

مشترکہ نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بالعموم جائداد اور ذرائع آمدنی کی تقسیم عمل میں نہیں آتی اور نہ اس کی ضرورت ہی

سمجھی جاتی ہے، اور بسا اوقات پشتہا پشت تک اسی طرح معاملہ چلتا ہے، عموما اس کی نوبت اس وقت آتی ہے جب شدید اختلاف کے بعد انتہائی کشیدہ ماحول میں ورثہ علحدگی پر مجبور ہوتے ہیں، پھر بہت سے پرانے تنازعات اور قصے سامنے آتے ہیں، حق تلفیوں اور زیادتیوں کے معاملات اجاگر ہوتے ہیں اور پھر لڑائی اور باہمی کشاکش کا ایسا دور شروع ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ ایسے قضیے اور تنازعات کو نپٹانا اور حل کرنا آسان نہیں ہوتا، یہ چیزیں تمام اہل خانہ کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہیں، اگر جداگانہ خاندانی نظام کورائج کیا جائے اور والدین بھی شادی کے بعد جلد ہی اپنی اولاد کو علیحدہ کردیں اور وراثت کی فوری تقسیم عمل میں آجائے تو شاید یہ دن کسی کو نہ دیکھنا پڑے۔

آپسی تعلقات کی خرابی

آپسی تعلقات کی خرابی بھی اس نظام کے مستلزمات میں سے ہے کیوں کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایک جگہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے ان سے طبیعت میں ایک طرح کی بیزاری پیدا ہوجاتی ہے، اس نظام میں سب کی ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی غلطیوں اور خامیوں پر نظر رہتی ہے اس لیے آئے دن جھگڑے، اختلافات اور چشمک کے مناظر سامنے آتے رہتے ہیں، اس بوجھ کے ناقابل برداشت ہوجانے کی صورت میں جب خاندان کا شیرازہ بکھرتا ہے تو اس کا عبرت ناک انجام نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے آپس میں ایک دوسرے پر الزامات کا دور شروع ہوتا ہے ایک دوسرے کی خامیوں اور کمیوں کو اچھالا جاتا ہے، دوسرے لوگ ایسے موقع پر تاک لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور ''لگے ہے آگ گھر میں تو ہمسائے ہوا دے ہے'' کے مصداق بنے رہتے ہیں، پھر یہ تعلقات ایسے ٹوٹتے ہیں کہ موت وحیات اور خوشی وغم میں بھی ایک دوسرے کے کام آنے سے گریز کرتے ہیں۔

تربیت کا خسارہ

تربیت کا خسارہ بھی اس نظام کے خساروں میں سے ایک ہے، مشترکہ خاندانی نظام میں کچھ افراد پردیس میں رہتے اور روپیہ پیسہ کما کر گھر بھیجتے ہیں وہ اپنے بال بچوں کی براہ راست تربیت نہیں کرپاتے، اپنی اولاد کو اپنے ساتھ پردیس میں رکھ نہیں سکتے کہ گھر کے ذمہ دار اس کی اجازت نہیں دیتے یا اولاد کو اپنے ساتھ رکھ کر وہ ماہانہ رقم اپنے گھر والوں کو نہیں دے سکتے کیوں کہ آمدنی محدود ہے ساری رقم اپنی فیملی پر خرچ ہوجارہی ہے۔ بیوی کی تربیت کا خسارہ بھی اس نظام کا لازمہ ہے کیوں کہ اس نظام میں بسا اوقات شوہر اپنی بیوی کو بہت سی ان باتوں اور معاملات سے نہیں روک سکتا جنہیں از روئے دین وہ غلط سمجھتا ہے۔ بڑوں کا ادب اور خاندانی نظام کا تقدس اس راہ میں حائل رہتا ہے۔

دینی خسارہ

نماز باجماعت کی دین میں کیا اہمیت ہے، تنہا نماز پڑھنے اور جماعت سے نماز پڑھنے کے ثواب میں کتنا فرق ہے، ان کو متعین اوقات میں ادا کرنے کی کتنی تاکید ہے؟ عوام وخواص سبھی اس سے واقف ہیں، مگر مشترک خاندان کے ازدحام میں مقررہ اوقات میں زوجین کا غسل جنابت کرکے نماز کا ادا کرنا ایک چیلنج بنا رہتا ہے، اگر شوہر اپنی قوت ارادی سے اس مہم کو سر کر بھی لے جائے تو بیوی کا فطری جذبۂ حیاء بہرحال اس راہ میں مانع بنا رہتا

ہے، ویور، دیورانی، جٹھانی ان کے چھوٹے بڑے بچے ساس اور نندوں کے ازدحام میں سہولت کے باوجود اس کے لئے وقت بے وقت غسل کر لینا مشکل ہے، مسلمان معاشرے کے بیشمار افراد ہیں جن کی نماز میں محض مشترکہ خاندان کے نامطلوب نظام کے نتیجے میں نقص اور خلل کا شکار ہیں۔

مالی خسارہ

مالیاتی اعتبار سے اس نظام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نظام کا یہ مطلوب ہوتا ہے کہ گھر کا ہر کمانے والا اپنی کمائی گھر کے نگراں یا ذمہ دار کے حوالے کر دیا کرے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی کمائی اپنے فائدے کیلئے استعمال میں دیکھنا چاہتا ہے اس لئے اس نظام پر سو فیصد عمل اس کے لئے بے حد دشوار معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ کمائی کا ایک حصہ خاندان کے سربراہ کے حوالے کرتا ہے تو ایک حصہ مختلف چور دروازوں کو استعمال کر کے الگ پس انداز کرتا ہے چونکہ کمائی میں سب برابر نہیں ہوتے سب کی صلاحیتیں اور مواقع یکساں نہیں ہوتے اس لئے دیر یا سویر اس پر غیر فطری نظام کا شیرازہ بکھرتا ہے تو جو جتنا مخلص اور اپنے اہل وعیال کے مفادات سے جتنا ہی لاپرواہ ہوگا انجام کار حسرت وندامت بھی اس کے حصہ میں زیادہ سے زیادہ آئے گی۔

افراد خانہ میں فرق و امتیاز

مشترک خاندان کے تمام افراد کے درمیان بظاہر یکساں سلوک ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر زیادہ کمانے والے کو کم کمانے والے کے مقابلہ گھر میں زیادہ عزت وتوقیر حاصل ہوتی ہے، اور یہ عزت اور توقیر اس کی بیوی بچوں تک کو مشتمل ہوتی ہے، ایسے نظام میں وہ بچے جنکہ والدین زیادہ روپے پیسے کماتے ہیں یا وہ بیوی جنکے شوہر گھر میں زیادہ آمدنی کا ذریعہ ہیں، شان وشوکت اور رعب ودبدبہ سے رہتے ہیں ایسی بیوبیاں دوسری عورتوں کو جن کے شوہر ان کے شوہر کے مقابلہ میں کم کماتے ہیں طعنے دیتی ہیں ارو اپنی شان امتیازی ظاہر کرتی ہیں۔

بے پردگی

شریعت مطہرہ میں پردہ کا جو بنیادی مقصد ہے، عصمت و عفت کی حفاظت اور جنسی تعلقات کی پردہ پوشی اسی مقصد کے لئے ہے، بعض اوقات شریعت نے محرم مردوں کو بھی پابند بنایا ہے کہ وہ گھر کے اندر داخل ہوتے وقت اجازت لیں، تفصیل سورۃ نور آیت ۵۸ کے تحت دیکھی جاسکتی ہے، نیز شریعت نے ایسے لوگوں کے دائرہ کو محدود سے محدود تر کر دیا ہے جن کے سامنے عورت کو بے حجاب آنے کی اجازت دی گئی ہے (النور ۳۱) اور وہ ایسے لوگ ہیں جن سے عورت کے لئے رشتۂ نکاح قائم کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہے یا انہیں جنسی تعلقات سے آگاہی کا کوئی مطلب نہیں ہے شوہر کا بھائی، بھتیجا بھانجا اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

اور مشترکہ خاندان میں ان لوگوں سے زینت کی جگہوں اور ستر کے حصوں کو چھپانا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

اور یہ وہ رشتہ دار ہیں جن سے پردہ کے سلسلے میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ نے غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں سے بھی سخت احتیاط برتنے کی ہدایت فرمائی۔

آپ ؐ کا ارشاد ہے۔ اجنبی عورتوں کے پاس جانے سے بچو، ایک انصاری صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ حمو (دیور)

کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ حمو تو موت ہے (صحیح مسلم ۲/۱۱۲۷)

حمو سے مراد شوہر کے عزیز و اقارب ہیں جن سے عورت کا نکاح ہوسکتا ہے شوہر کے رشتہ داروں سے خلوت نشینی، اجنبیوں کے ساتھ خلوت میں رہنے سے کہیں زیادہ خطرناک اور اندیشناک ہے اور اسی وجہ سے مشترکہ خاندانی نظام میں یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

مذکورہ حدیث کی شرح میں علامہ نوویؒ لکھتے ہیں، دوسروں کے بالمقابل شوہر کے رشتہ داروں سے اندیشہ زیادہ ہوتا ہے، اس سے برائی کے امکانات اور فتنہ میں بڑ جانے کا خوف زیادہ ہوتا ہے اس لئے کہ اسے عورت تک رسائی اور اس کے ساتھ تنہائی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور اسے برا بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ (المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج ۱۳۶۰/)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جن عورتوں کے شوہر سفر میں ہوں ان کے یہاں مت جاؤ، کیوں کہ شیطان تمہارے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے۔

چونکہ مشترکہ خاندانی نظام میں بے پردگی عام ہوتی ہے اور اس سے بچنا بہت دشوار ہوتا ہے اس لئے اس پہلو سے بھی یہ نظام شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہے اور دین اسلام سے میل نہیں کھاتا۔

حدود اللہ کی خلاف ورزی

مشترک خاندان کی ترکیبی ہیئت پر غور کیجئے تو سب سے بڑا اور تشویش انگیز مسئلہ اللہ کے حدود کی ناپاسداری ہے۔ اللہ تعالیٰ کو فرد اور معاشرہ کی پاکیزگی وطہارت مطلوب ہے۔ وہ گندگی اور فحاشی کو معاشرت سے ختم کرنا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ معاشرہ گندگی و بے حیائی کے کاموں میں مشغول اور ملوث ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرت کو ان بنیادوں پر استوار کیا ہے جس میں ان محرکات و امکانات کا بھی سدّ باب ہو گیا ہے۔ جو فتنوں کی پرورش کرتے اور فحاشی و عریانیت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ سورۂ نور جو معاشرتی تذکیر کی سورہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو سوائے اس کے کہ ان گھر والوں سے اجازت حاصل کرلو اور ان سے سلام کرلو یہی تمہارے لئے بہتر ہے، امید ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے'' (نور ۲۷)

اور اے نبی! اہل ایمان خواتین سے کہہ دیجئے اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔ اپنی آرائش کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اپنے شوہروں، اپنے باپ، شوہر کے باپ، اپنے بیٹوں اپنے شوہروں کے بیٹوں بھائیوں بھتیجوں بھانجوں، اپنی عورتوں، لونڈیوں اور ان بچوں کے جو عورتوں کے اسرار سے ناواقف ہیں۔ (النور ۳۱)

سورۂ نور کے اندر اور بھی بہت سی آیتیں اور ارشارات ہیں جو نفس مسئلہ پر واضح روشنی ڈالتے ہیں مگر ان میں صرف دو آیتوں پر غور کیجئے اہل ایمان کو صرف اپنے گھروں اور بیوی بچوں میں بلا تکلف آنے جانے کی اجازت دی گئی ہے مگر دوسروں کے گھروں اور بیویوں سے اختلاط پر پابندی لگائی گئی ہے، بے ڈھڑک جب چاہو کسی کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے،

اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جاؤ۔ اسی طرح اہل ایمان خواتین کو اپنی آرائش وزیبائش کے بے محابا نمود واظہار پر پابندی عائد کردی گئی ہے وہ صرف اپنے شوہر اور محرم مردوں کے سامنے ہی بے حجاب اور آرائش کے ساتھ آسکتی ہیں اب ذرا غور کیجئے کہ مشترک خاندان میں کیا ان اصولوں کی پابندی و پاسداری ممکن ہے اور عملا ایسے خاندان میں کیا اللہ کے حدود نہیں توڑے جارہے ہیں کیا غیر محرم کا بے جا آنا جانا نہیں ہوتا اور پھر جو فتنے آئے دن پیدا ہوتے ہیں اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

فضول خرچی اور لا پرواهی

بعض لوگ مشترکہ خاندانی نظام کا یہ فائدہ بتاتے ہیں کہ اس نظام کی وجہ سے سرمایہ کی بچت ہوتی ہے اور کفایت شعاری کو فروغ ملتا ہے، اس لیے کہ اگر دس لوگوں کے لئے الگ الگ کھانا پکایا جائے تو خرچ زیادہ آئے گا اور اگر دس لوگوں کا کھانا ایک جگہ بنایا جائے تو اس کے بالمقابل کم خرچ ہوگا، لیکن یہ مسئلہ کا ایک رخ ہے، یہ تصویر کا ایک پہلو ہے، تصویر کا دوسرا رخ اور سکہ کا دوسرا پہلو بہت تکلیف دہ اور بھیانک ہے کہ مالیات مشترک ہونے کی وجہ سے ہر شخص اسے مفت مال سمجھ کر کے ''مال مفت دل بے رحم'' کا سلوک کرتا ہے اور اپنے ہی گھر کے سامان کو پرایا مال سمجھ کر نہایت بے احتیاطی اور بے دردی سے استعمال کرتا ہے اور کھانے پینے کی چیزوں میں، استعمالی سامانوں میں فضول خرچی اور لاپرواہی برتتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ازواج مطہرات کے کھانے پینے کا مشترکہ نظام نہیں رکھا حالانکہ رہائش الگ ہونے کے باوجود اگر کھانے کا نظم مشترک کردیا جاتا تو قدرے بچت ہوجاتی لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے مالی معاملے کو بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ اور جداگانہ رکھا، یہاں تک کہ اگر ایک کے یہاں کا سامان دوسرے کے یہاں ضائع ہوجاتا تو اس کا تاوان ادا کرتے۔

بخاری شریف میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ مشترکہ خاندان میں چونکہ کسی شخص کی الگ مالی حیثیت کا تعین نہیں ہوتا اس لئے وسائل کی بربادی ہوتی ہے اور گھر کے سامانوں کے استعمال میں حد درجہ بے احتیاطی برتی جاتی ہے دس بیس سال تک چلنے والا سامان چند برسوں میں بربادی کا شکار ہوجاتا ہے۔

پرائیوسی کا خاتمہ اور جنسی ناآسودگی

مشترکہ خاندانی نظام میں انسان کی راز داری اور پرائیوسی متاثر ہوتی ہے، اس نظام میں پرائیوسی کے ان اصولوں کو اپنانا بہت ہی مشکل ہے جس کی ہمیں قرآن وحدیث تعلیم دیتے ہیں:

''اے ایمان والو! تمہارے غلام اور وہ لڑکے جو حد بلوغ کو نہیں پہنچے ہوں تین وقت میں تم سے (تخلیہ میں آنے کی) اجازت حاصل کرلیں'' ایک نماز فجر سے پہلے، دوسرے ظہر کے وقت جب تم آرام کے لئے کپڑے اتار لیتے ہو اور عشاء کے بعد، تین وقت تمہارے لیے پردے کے ہیں، ان کے علاوہ نہ تم پر کوئی الزام ہے نہ ہی ان پر'' (النور ۵۸)

''مشترکہ خاندانی نظام میں اگر میاں بیوی خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنا بھی چاہیں تو دشوار ہے، متعدد روایتوں میں ہے کہ اللہ کے رسول گھریلو کاموں میں ازواج مطہرات کے ساتھ تعاون کیا کرتے تھے'' (صحیح بخاری)

''ایک ساتھ ایک ہی برتن سے غسل جنابت کرلیا کرتے'' (بخاری مسلم)

مولانا سلطان احمد اصلاحی اپنی کتاب مشترکہ خاندانی نظام میں لکھتے ہیں:

''مستقل مکان اور اس سے ملحق سہولیات کا ہر انسان فطری طور پر طلبگار ہوتا ہے کیوں کہ پرائیوسی انسان کی فطرت میں داخل ہے، اگر یہ سہولیات اسے حاصل نہ ہوں تو وہ مسلسل بے چینی کا شکار رہتا ہے، جنسی تسکین کا معاملہ بھی ایک طرح سے نفسیات سے جڑا ہوا ہے اور ہر شادی شدہ شخص یا جوڑے کے لئے مکان کی الگ یونٹ ہی یہ تسکین فراہم کرسکتی ہے'' (مشترکہ خاندانی نظام از سلطان احمد اصلاحی)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''پھیلے ہوئے گھر میں اس کی تشنگی اظہر من الشمس ہے، جہاں مرد اپنی بیوی سے بچ بچا کر اور دب دبا کر جنسی تسکین کا سامان کرسکتا ہے جبکہ جنس (SeX) کے سلسلے میں اسلام کی حساسیت معلوم ہے کہ وہ رشتہ ازدواج سے باہر جنسی تسکین کو انتہائی جرم قرار دیتا ہے اور اس کے مرتکب کو سخت ترین سزا کا مستوجب ٹھہراتا ہے'' (مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام)

روایتوں پر غور کریں کہ اللہ کے رسول ﷺ حضرت عائشہ کے ساتھ غسل جنابت ایک برتن کے پانی سے کرتے تھے، حضرت ام سلمہؓ کے بارے میں اسی طرح کی روایتیں آتی ہیں۔ ایسے ہی حالت حیض میں حضرت عائشہؓ کا کسی برتن سے پانی پینا پھر برتن کے اسی جگہ سے اللہ کے رسولؐ کا پانی پینا جہاں سے حضرت عائشہؓ پانی پی چکی ہوتی ہیں، اسی کیفیت کے ساتھ دونوں کا گوشت کا ٹکڑا کھانا اور اس جیسے دوسرے واقعات کو سامنے رکھیں اور موجودہ طرز معاشرت کو دیکھیں تو اس قسم کی بے تکلف معاشرت کا دور دور تک امکان بھی نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح نگاہ کی حفاظت اور عصمت و عفت کے لئے ضروری ہے کہ مرد اپنی خواہش کے مطابق دن و رات کے جس حصہ میں چاہے اپنی ضرورت پوری کرلے اسے اس کے لئے آسانی اور اس کے مواقع میسر ہونے چاہیے۔ قرآن مجید نے تو عورت کو مرد کی کھیتی قرار دیا ہے اور ایسے ہی ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے تاکید کی کہ جب کوئی مرد اپنی عورت کو اپنی ضرورت کے لئے بلائے تو فورا آجائے اگرچہ روٹی جل ہی کیوں نہ جائے۔ (ترمذی)

کسی اجنبی عورت پر نگاہ پڑ جائے، اور اس آدمی کے جذبات انگڑائی لینے لگیں تو اسے اپنی شریک حیات (بیوی) کے پاس آکر فورا اپنی ضرورت پوری کرلینی چاہیے۔ مزید ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت نے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزوں سے منع بھی کیا ہے۔

تو کیا یہ اور اس قسم کے دیگر احکام و ہدایات پر عمل مشترکہ خاندانی نظام کے ازدہام (بھیڑ) میں ممکن ہے سچ یہ ہے کہ مکان کی علیحدہ یونٹ ہی اس کا واحد حل ہے۔

مشہور حنفی عالم اور فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

''لانه يحتاج إلى جماعها ومعاشرتها فى اى وقت يتفق ولا يمكن ذلك مع ثالث'' (ردالمحتار ۳۲۱/۵)

شوہر کو کسی بھی وقت عورت کے ساتھ رہنے اور ہم بستری

کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور کسی تیسرے کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔

خاندان کا ایک ذات پر منحصر رهنا

مشترکہ خاندانی نظام کی اس خرابی سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس نظام میں عام طور پر کمانے والوں کی تعداد کھانے والوں سے بہت کم ہوتی ہے۔ کمانے والا ایک ہوتا ہے اور دس بیٹھ کر مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں، ان گھروں میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو کام کرسکتے ہیں، مگر کرنا نہیں چاہتے۔ جس کا منفی اثر خاندان کے علاوہ ملک کی معیشت پر بھی پڑتا ہے اور اس طرح آمد وخرچ کا توازن بگڑ جاتا ہے، جبکہ جداگانہ خاندانی نظام میں خاندان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی مکلّف ہوتی ہے اور خاندان کا ہر ہر فرد بہتر سے بہتر ذریعہ آمدنی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مشترکہ خاندان کا ایک بڑا نقص اور کمی یہ بھی ہے کہ اگر خاندان کا کوئی فرد بے کار ہے تو اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اس کی شادی کردو تو وہ خود بخود سیٹ ہوجائے گا، لیکن اگر اس میں ناکامی ملتی ہے تو خاندان کے دوسرے لوگوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

قرآن مجید نے اس سلسلے میں جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ مرد اگر بیوی کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا نہ کرسکے تو اسے شادی نہیں کرنی چاہیے ارشاد خداوندی ہے۔

''اور چاہیے کہ بچے رہیں (پاکدامن رہیں) وہ جو کہ نکاح (مقدور) نہیں پاتے یہاں تک اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کردیں'' (النور ۳۳)

عام طور پر ایسے خاندان کے بارے میں مشاہدہ یہی ہے کہ جب تک والد زندہ رہتے ہیں خرچ برداشت کرتے ہیں کیوں کہ ہر باپ کو بہر حال اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے، پھر والد کے انتقال کے بعد جب بھائیوں میں بٹوارا ہوتا ہے، تو پھر ہنگامی دور شروع ہوجاتا ہے، آپسی تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں، بڑا بھائی تمام افراد کا خرچ برداشت کرنا نہیں چاہتا اور بالآخر سارے بھائی الگ ہوجاتے ہیں، بعض دفعہ مالی تنگی کی وجہ سے چھوٹا بھائی یا مالی اعتبار سے جو بھی کمزور ہوتا ہے وہ قرض وغیرہ لے کر گلف کنٹری (خلیجی ممالک) کا رخ کرتا ہیں اور وہاں ظالمانہ نظام اور خود کے مال و دولت کی حرص کی وجہ سے سالہا سال بیوی بچوں سے دور رہتے ہیں اور اولاد اور بیوی کو قریبی رشتہ داروں کے رحم وکرم کے حوالے کردیتا ہے، جس کا بسا اوقات بھیانک انجام ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلموں تک سے تعلقات قائم ہوجاتے ہیں اور معاشرے میں سنگین مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں اور جب وہ برسہا برس کے بعد لوٹتا ہے تو گھر کا ماحول اور منظر کچھ اور پاتا ہے، بعض دفعہ ایسا شخص نیم پاگل یا پاگل ہوجاتا ہے کیا اس حقیقت سے انکار کی جرأت کوئی کرسکتا ہے۔

حساب و کتاب کی عدم شفافیت

شفافیت بھی مشترکہ خاندان کا ایک بہت اہم اور بڑا مسئلہ ہے۔ مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں۔

''مشترکہ نظام میں ایک بہت بڑا مسئلہ حسابات کی عدم شفافیت اور ہر شخص تک اس کی محنت اور سرمایہ کے مطابق منافع کے پہنچنے کا ہے، ایک گھر میں متعدد افراد ایک ساتھ گذر بسر کرتے ہیں ان میں کسی کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے کسی کی کم، کسی

کے اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ ہوتے ہیں تو کسی کا کم، والدین اگر حیات ہوں تو کوئی بیٹا گھر کے خرچ یا کاروبار کے لئے زیادہ پیسہ دیتا ہے کوئی کم، ظاہر ہے کہ ہر شخص یکساں آمدنی اور خرچ کا تو مالک نہیں ہوسکتا، ہر شخص کی اپنی صلاحیتیں اور مواقع ہوتے ہیں، لیکن مشترکہ نظام میں باہمی جذبۂ تعاون کو بنیاد بنا کر اس تفاوت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، بالخصوص باپ کی موجودگی میں یہ مسئلہ ہرگز زیر بحث نہیں آتا، لیکن جب سخت حالات میں سب کی جدائیگی عمل میں آتی ہے تو مشترکہ جائداد کی تقسیم برابر برابر حسبِ حصۂ شرعی کی جاتی ہے، فقہاء بھی یہی فرماتے ہیں کہ چونکہ ملکیتیں ممتاز نہیں ہیں اس لیے سارے لوگ باپ یا رئیس خاندان کے معاون تصور کیئے جائیں گے اور موجود اثاثہ پر سب کا حق برابر ہوگا اور تقسیم حسب حصص شرعی انجام پائے گی (ردالمختار کتاب الشرکہ ۳/۳۸۳)

مگر اس کے بعد کتنی پیشانیاں شکن آلود ہوتی ہیں، بغض و نفرت کینہ وحسد اور تہمت والزام تراشی کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، زیادہ کمائی دینے والے کو اپنے خسارہ کا احساس، اور کم دینے والے کو مزید لینے کی فکر.....اس وقت سارا جذبۂ تعاون ہوا ہوجاتا ہے اور ایک گھر کے افراد باہم برسرِ پیکار نظر آتے ہیں جیسے صدیوں کی دشمنی چلی آرہی ہو الامان والحفیظ۔

کیا فائدہ ایسے مشترکہ نظام اور وقتی جذبۂ تعاون کا، جس کا انجام اتنا بھیانک ہو..... اکثر لوگ اس اذیت ناک بھٹی سے گذرتے ہیں.....اور شرعی مسائل کی بنیاد عام حالات پہ ہوتی ہے نہ کہ مخصوص اور استثنائی حالات پر.....'' (مشترکہ خاندانی نظام)

فاضل مقالہ نگار مزید لکھتے ہیں:

''مشترکہ رہائش کا مقصد باہم جذبۂ تعاون کو فروغ، خاندانی رشتوں کا احترام، بزرگوں کے زیر سایہ چھوٹوں کی تربیت، ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ، کچھ دن محنت پھر آرام کی فطری خواہش اور ہر شخص کی اس میں حصہ داری کا لحاظ اور تنہائی و بے کسی کے کرب سے ہر ایک کی حفاظت، جس کی نوبت ایک نہ ایک دن بڑھاپے میں ہر شخص کو آتی ہے وغیرہ، لیکن آج کے دور میں جہاں اکثر اخلاقی قدریں زوال پذیر ہورہی ہیں، ان میں باہم اشتراک کے ساتھ ان بلند مقاصد کا حصول مشکل ہوگیا ہے، عموماً ایک ساتھ رہنے کے نتیجے میں باہم اختلاف بڑھتا ہے، رشتوں کا توازن بگڑتا ہے، ماحول میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے نزدیکیاں دوریوں میں بدلتی رہیں، باہم مخلصانہ جذبات کمزور پڑنے لگتے ہیں تعاون کے بجائے ضرر کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے حقوق وفرائض کا احساس تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے، حق تلفیاں عام ہوجاتی ہیں، بزرگوں کا احترام بے کیفی اور بدمزگی میں بدل جاتا ہے، رسم و روایات کے جبر سے بغاوت وجود میں آتی ہے، سب ملکر آگے بڑھنے کے بجائے ایک دوسرے کو پچھاڑنے اور نیچا دکھانے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور اس ضمن میں اکثر جانی ومالی زیادتیاں بھی ہوتی ہیں''

اس مسئلہ کا صحیح حل کیا ہے؟

چونکہ شریعت میں عام اصولوں کے مطابق ''منافع کے حصول سے زیادہ ضروری مفاسد کو دور کرنا ہے، اور فقہ کا مشہور قاعدہ اور ضابطہ ہے "دفع المضرۃ اولیٰ من جلب المنافع" اسی طرح شریعت اسلامی کا مزاج لا ضرر ولا ضرار ہے اور الضرر یزال ہے بعض اہم مقاصد کے

حصول کے لئے مشترکہ خاندانی نظام کے بجائے دفع مضرت کی خاطر علیحدہ خاندانی نظام کو منتخب کیا جائے اور اسی کو قابل ترجیح اور لائق قبول بنایا جائے۔

اور بقول گھر کے ایک گواہ کے اگر صحیح وقت پر اور شرعی اصولوں کی روشنی میں اولاد یا بھائیوں کو علحدہ رہائش مہیا کر دی جائے، اور ابتدائی تربیت دینی بنیادوں پر ہوئی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ الگ الگ رہ کر بھی افراد خاندان ان بلند مقاصد کے ممکنہ حصول کے لئے متحد نہ ہوں جو مشترکہ نظام کی روح ہیں اور ان مفاسد کو دور کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب نہ ہو سکے جو جداگانہ نظام کا لازمہ سمجھا جاتا ہے، جب ایک دوسرے سے مسائل وابستہ نہ ہوں گے، تو باہم تنازعہ نہیں ہوگا، محبت فروغ پائے گی، ہر شخص دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے گا۔

رہا بوڑھے والدین اور خاندان کے بے سہارا لوگوں کا مسئلہ تو ان کے لئے باہم مل جل کر اور اشتراک سے کوئی نظام مرتب کیا جا سکتا ہے، پورے خاندان کے افراد کے درمیان حسب مرتبہ اس کے لئے کوئی ترکیب اور ترتیب بنائی جائے۔ پھر یہ کہ ہر ایمان والا والدین، خاندان کے بزرگوں اور نادار و محتاج رشتہ داروں کی خدمت کی اہمیت جانتا ہے۔ اگر محبت کے ماحول میں باہم مشورہ سے کسی نظام کا تعین ہو تو نارمل حالات میں خاندان کے افراد کا تعاون حاصل ہونا دشوار اور مشکل کام نہیں ہے، ایک مسلمان گھرانے میں ان اخلاقی تعلیمات اور نصرت واعانت کی فضا تو ہونی ہی چاہیے۔ اگر یہ خوبیاں نہیں تو ہم اس کو اسلامی معاشرہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام

مشترک خاندانی نظام اور جداگانہ خاندانی نظام کی خوبیاں خامیاں دشواریاں راقم السطور نے کافی تفصیل سے بیان کر دیا ہے، چونکہ یہ مسئلہ کافی حساس اور اہم ہے اور ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھنے کے لئے اس پر کافی غور کی ضرورت ہے لہذا علماء اور اہل علم کو اس موضوع پر کھل کر لکھنا چاہیے۔

راقم السطور کی رائے میں ایک مشروط جداگانہ خاندانی نظام زیادہ بہتر ہے جو شرعی قباحتوں سے بالکل پاک ہو، لیکن وہ علیحدہ نظام نہیں جس کا تجربہ دنیا نے فرانس کے صنعتی انقلابات کے بعد کیا ہے اور ساری دنیا اب جسکی لپٹ میں ہے صنعتی ممالک اور ترقی پذیر دنیا میں جس کے نظارے ہر جگہ عام ہیں، معاش کے تقاضوں نے آسودہ و شریف خاندانوں کو بھی بری طرح سے بکھیر دیا ہے اور وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر اس طرح بکھر گئے ہیں کہ اکثر خوشی وغم کے مواقع بھی انہیں یکجا نہیں کر پاتے ایسے نظام کو علحدہ خاندانی نظام کے بجائے صنعتی نظام کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے احقر ایک ایسے معیاری نظام اور معاشرت کا حامی اور قائل ہے جس میں اسلام کی شانِ اعتدال خوب نمایاں ہو ایسی معاشرت جو نہ مشترک اور نہ ٹوٹی ہوئی اور لاتعلق ہونا بلکہ فرائض و ملکیت کی علاحدگی کے ساتھ اخوت و محبت کی دوڑ میں سبھی باہم مربوط ہوں، لوگ دوطرفہ طور پر خیر خواہانہ اور الفت آمیز سلوک اپنا فرض سمجھتے ہوں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہر اکائی دوسری اکائی کو تقویت پہنچائے اور گہرے جذبۂ اپنائیت کا احساس دلاتی رہے۔

☆☆☆

تذکرہ

شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی حیات وتعلیمات

مولانا ندیم احمد انصاری (ایم اے، جرنلسٹ)
ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن ومہتمم مدرسہ نورِ محمدی (ممبئی)

ماہِ ربیع الآخر یا ماہِ ربیع الثانی اسلامی سال کا چوتھا مہینہ ہے۔ اس مہینہ سے متعلق اسلامی شریعت نے کوئی خاص حکم نہیں دیا، البتہ اس مہینہ میں برصغیر میں ایک عمل بہت رواج پا گیا ہے، جسے شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اور وہ ہے ''گیارہویں شریف''۔ ہم اولاً ماہِ ربیع الآخر کی وجہِ تسمیہ سے متعلق کچھ عرض کریں گے، اس کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی مختصر ترین حیات اور ان کی تعلیمات ہدیۂ قارئین کریں گے اور آخر میں گیارہوں شریف کے متعلق شرعی حکم بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ

ربیع الآخر کی وجہ تسمیہ

شیخ علم الدین سخاوی علیہ الرحمہ اپنی کتاب ''المشهور فی اسماء الایام والشهور'' میں فرماتے ہیں کہ ربیع الاول کے نام کا سبب یہ ہے کہ اس مہینے میں ان (اہلِ عرب) کی اقامت ہوجاتی ہے۔ ارتباع کہتے ہیں اقامت کو، اس کی جمع اربعاء ہے۔ 'ربیع الآخر' کے مہینے کا نام رکھنا بھی اسی وجہ سے ہے، گویا کہ یہ اقامت کا دوسرا مہینہ ہے۔ شهر ربیع الاول سمی بذلك لارتباعهم فیه، والارتباع: الاقامة فی عمارة الربع، وبجمع علی اربعاء...... وربیع الآخر کالاول۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱۹۵/۷)

اس سے زیادہ موزوں بات ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ربیع الاول کو ربیع الاول اس لیے کہتے ہیں کہ ربیع کے ایک معنی بہار کے ہیں، اور چونکہ اس مبارک مہینہ میں خلاصۂ کائنات حضرت محمد ﷺ کی ولادت وقوع پذیر ہوئی، اس لیے اسے موسمِ بہار سے موسوم کیا گیا، اور اس کے بعد والے مہینے کو بہار کا دوسرا مہینہ یعنی ربیع الآخر۔ کسی کو اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ نام تو قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور ولادتِ نبوی ﷺ سے پہلے بھی یہی نام مشہور تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھی تو اس مبارک گھڑی کے وقوع پذیر ہونے کا علم ازل سے ہے، اسی لیے یہ نام مشہور کر دیے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی حیات

شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کے متعلق ہمارا ماننا یہ ہے کہ آپؒ ایک عالم باعمل اور متبع شریعت ولی اللہ تھے۔ آپؒ کی ولایت اور مقام ومرتبہ خود آپؒ کی کتابوں سے سے معلوم ہوتا ہے۔ (فتاویٰ حقانیه: ۲۰۴/۱ بتغیر)

تعارف

شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کا پورا نام عبدالقادر بن ابو

صالح عبداللہ بن جنکی دومت الجیلی (الجیلانی) ہے، اور آپ کی کنیت ابو محمد اور آپ کا لقب محی الدین اور شیخ الاسلام ہے۔ آپ حنبلی مسلک کے پیروکار تھے۔قال الذهبی: الشيخ الامام العالم الزاهد العارف القدوة، شيخ الاسلام، علم الاولياء، محى الدين ابو محمد، عبدالقادر بن ابى صالح عبدالله ابن جنكى دومت الجيلى الحنبلى، شيخ بغداد۔ (سير اعلام النبلاء: ٢٠/٤٣٩، رقم: ٢٨٦ ، وانظر فوات الوفيات: ٢/٣٧٣ للكتبىؒ، كتاب الذيل على طبقات الحنابلة لابن رجب: ١/٢٩٠)

آپ والدہ کی طرف سے حسینی اور والد کی طرف سے حسنی سید ہیں۔صاحبِ 'بهجة الاسرار' اور مولانا جامیؒ نے 'نفحات الانس' میں آپ کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: **عبدالقادر بن ابى صالح جنكى بن موسىٰ بن عبدالله بن يحيىٰ زاهد بن محمد بن داؤد بن موسىٰ الجون بن عبدالله المحض بن حسن مثنى بن سيدنا حضرت حسينؓ بن علىؓ اسد الله الغالب حضرت علىؓ بن ابى طالب** ۔اس طرح آپؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی گیارہویں نسل تھے۔(فيوضِ يزدانى ترجمه الفتح الربانى: ٩)

شیخ کے عقائد

شیخ کے عقائد اہل السنۃ والجماعت کے عقائد تھے، وہ بزبانِ خود فرماتے ہیں کہ ''ہمارا عقیدہ وہی ہے جو تمام صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحینؒ کا ہے۔''فقال: اعتقادنا اعتقاد السلف الصالح والصحابةؓ۔(سير اعلام النبلاء: ٢٠/٤٤٢)

تاریخ ومقامِ ولادت

شیخ کی ولادت ۴۷۱ھ (یا ۴۷۰ھ) میں جیلان میں ہوئی۔اسی نسبت سے آپ کو جیلانی کہتے ہیں۔مولده بجيلان فى سنة احدىٰ وسبعين واربع مئة۔(سير اعلام النبلاء: ٢٠/٤٣٩، فوات الوفيات: ٢/٣٧٣) قال السمعانىؒ: هذه النسبة الى بلاد متفرقة وراء طبرستان ويقال لها كيل وكيلان فعرف ونسب اليها وقيل جيلى وجيلانى۔ (الانساب للسمعانى: ٣/٤١٤)

جیلان کہاں ہے؟

جیلان یا گیلان کو ویلم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے، اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں برز کا پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علاحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندان کا مشرقی حصہ ہے اور شمال میں بحر قزویں کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت للندوی: ١/١٩٧)

تعلیم

شیخ کی ابتدائی تعلیم کی تفصیل نہیں ملتی، امام ذہبیؒ کے مطابق عالمِ نوجوانی میں آپؒ بغداد تشریف لائے۔قال: وقدم بغداد شاب۔(سير اعلام النبلاء: ٢٠/٤٣٩، فوات الوفيات: ٢/٣٧٣)

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں: ''۱۸/ سال کی عمر میں غالباً ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے۔یہی وہ سال ہے، جس سال امام غزالیؒ نے تلاشِ حق وحصولِ یقین کے لیے

بغداد کو خیر باد کہا تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا۔'' (تاریخ دعوت وعزیمت للندوی: ۱۹۷/۱)

شیخ کے اساتذہ

شیخ کے اساتذہ میں علی سعد مخزومی، ابوغالب باقلانی، احمد بن مظفر بن سوس، ابوالقاسم بن بیان، جعفر بن احمد سراج، ابو سعد بن خشیش اور ابوطالب یوسفی رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ قال: فتفقه علی بن ابی سعد المخزومی، وسمع من ابی غالب الباقلانی، واحمد بن المظفر بن سوس، وابی القاسم بن بیان، وجعفر بن احمد السراج، وابی سعد بن خشیش وابی طالب الیوسفی، وطائفة۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۴۰/۲۰-۴۳۹)

شیخ کے تلامذہ

شیخ کے معروف تلامذہ میں علامہ سمعانی، عمر بن علی القرشی، حافظ عبدالغنی، شیخ موفق الدین ابن قدامہ، عبدالرزاق بن عبدالقادر، موسی بن عبدالقادر (یہ دونوں صاحب زادے ہیں) شیخ علی بن ادریس، احمد بن مطیع الباجسرائی، ابوہریرہ، محمد لیث الوسطانی، اکمل بن مسعود ہاشمی، ابوطالب عبداللطیف بن محمد قبیطی رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ قال الذهبی: حدث عنه: السمعانی، وعمر بن علی القرشی، والحافظ عبدالغنی، والشیخ موفق الدین ابن قدامة، وعبدالرزاق وموسی والداه، والشیخ علی بن ادریس، واحمد بن مطیع الباجسرائی، وابوهریرة، محمد ابن لیث الوسطانی، واکمل بن مسعود الهاشمی، وابوطالب عبداللطیف بن محمد بن محمد بن القبیطی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۴۰/۲۰)

شیخ کی اولاد

علامہ ذہبیؒ نے شیخ کے بیٹے کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ''میرے والد کی کل اولاد ۴۹ تھیں، جن میں ۲۷ بیٹے اور باقی سب بیٹیاں تھیں۔'' قال الذهبی: قال عبدالرزاق ابن الشیخ: ولد لابی تسعة واربعون ولداً، سبعة وعشرون ذکرا، والباقی اناث۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۴۷/۲۰، وانظر فوات الوفیات: ۳۷۴/۲)

وفات

شیخ نے ۹۰/ سال کی عمر تک چہار دانگ عالم کو اپنی ذاتِ والا صفات سے مستفیض فرمایا اور ۱۰/ ربیع الثانی ۵۶۱ھ کو آپ نے وفات پائی۔ قال الذهبی: عاش الشیخ عبدالقادر تسعین سنة، وانتقل الی اللّٰه فی عاشر ربیع الآخر سنة احدی وستین وخمس مئة۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۵۰/۲۰)

شیخ عبدالقادر جیلانی کی تعلیمات

شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ علماءِ ربّانیین میں بلند مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے قول وعمل سے اللہ کے بندوں کو اللہ کی دعوت دی اور کتاب وسنت کے مطابق ان کی رہنمائی کی۔ لیکن افسوس آج ان سے محبت کا دم بھرنے والوں نے بھی ان کی تعلیمات سے سرِ مو انحراف کیا اور محض چند رسمی سی چیزوں کا کر لینا ان کے نزدیک محبت کی علامت

ٹھہرا۔ایسے میں سخت ضرورت ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔اسی کے پیشِ نظر یہاں حضرتؒ کے مواعظ سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔حق تعالیٰ شانہ ہم سب کو حق کہنے،حق سمجھنے اور حق پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازے۔

سب کچھ اللہ کے دستِ قدرت میں ہے

بادشاہ ایک ہی ہے،نقصان پہنچانے والا ایک ہی ہے،نفع پہنچانے والا ایک ہی ہے۔حرکت دینے والا ایک ہی ہے، سکون دینے والا وہی ایک۔مسلط کرنے والا وہی ایک۔مسخر بنانے والا وہی ایک۔معطی اور مانع وہی ایک اور خالق وروزی رساں وہی ایک.....یعنی اللہ عزوجل۔(مجلس: ۱۳، فیوضِ یزدانی: ٦٨)

خالق کے سامنے تمام مخلوق عاجز ہے

ساری مخلوق عاجز ہے نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچاسکتا ہے نہ نقصان۔بس حق تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں سے کرادیتا ہے۔ اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے،جو کچھ تیرے لیے مفید یا مضر ہے،اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے،اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔(مجلس: ۱۳، فیوضِ یزدانی: ۸۸)

اصل محرومی اور اصل موت

اپنے آقا کی خوشنودی سے محروم ہے وہ شخص جو اس کی تو تعمیل نہ کرے جس کا وہ حکم فرماوے اور جس کا اس نے حکم نہیں دیا اس میں مشغول رہے۔یہی اصل محرومی اور اصل موت اور اصل مردودیت ہے۔(مجلس: ٦٠، فیوضِ یزدانی: ٣٥٦)

رضا بر قضا

اے خدا سے غافل! تو غیر کی طلب میں مشغول ہوکر اس کی ذات ورضا برقضا سے غافل مت ہو۔ بسا اوقات تو اس سے فراخیٔ معاش کا طالب ہوتا ہے اور کیا عجب ہے کہ وہ تیرے لیے فتنہ ہو اور تجھے علم نہ ہو۔تو نہیں جانتا کہ بہتری کس چیز میں ہے۔پس خاموش رہ اور جس حال میں بھی وہ رکھے اس میں اس کا موافق (مطیع) بنا رہ،اور اس سے ہر حالت میں اس کے افعال پر رضا اور شکر کا طالب ہو۔وہ رزق کی وسعت جس پر شکر نہ ہو فتنہ ہے اور وہ معاش کی تنگی بھی جس پر صبر نہ ہو فتنہ ہے۔(مجلس: ٥٥، فیوضِ یزدانی: ٣٢٥)

بندگی آزمائش کے وقت ظاہر ہوتی ہے

اے کذاب! تو نعمت کی حالت میں خدا کو محبوب سمجھتا ہے، لیکن جب بلا آتی ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔گویا کہ اللہ عزوجل تیرا محبوب تھا ہی نہیں۔بندہ تو آزمائش کے وقت ہی ظاہر ہوتا ہے۔(مجلس: ١، فیوضِ یزدانی: ٢٩)

آزمائش ضروری ہے

آزمائش وامتحان ہونا ضروری ہے،خصوصاً دعویٰ کرنے والوں کا۔اگر امتحان وآزمائش نہ ہوتی،تو بہتیری مخلوق ولی ہونے کا دعویٰ کرنے لگتی۔(مجلس: ٥٣، فیوضِ یزدانی: ٣٠٣)

اللہ کی نافرمانی کا انجام

نفس جب اللہ کا مطیع ہوجاتا ہے،تو اس کا رزق بوسعت ہر جگہ سے اس کو پہنچتا ہے، پھر جب نافرمانی کرتا ہے،تو رزق کے اسباب منقطع اور اس پر مصیبتیں مسلط ہوجاتی ہیں۔پس وہ

دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ پاتا ہوا ہلاک ہوجاتا ہے۔ (مجلس: ۵۱، فیوضِ یزدانی: ۲۸۷)

نفس کی مخالفت

اے نادان! تو چاہتا ہے کہ جس شے کو چاہے بدل دے۔ کیا تو دوسرا معبود ہے؟ چاہتا ہے کہ اللہ عزوجل تیری موافقت کرے؟ یہ معاملہ برعکس ہوگیا۔ اس کا عکس کر کہ راہِ صواب پائے۔ اگر تقدیری احکامات نہ ہوتے تو جھوٹے دعووں کی شناخت نہ ہوتی، تجربوں ہی سے جواہرات کھلتے ہیں۔ تیرا نفس جیسا حق تعالیٰ کے حکم پر راضی ہونے سے منکر ہے، ایسا ہی تو اپنے نفس کا منکر بن (تاکہ حق تعالیٰ کے حکم پر عمل کر سکے)۔ (مجلس: ۷، فیوضِ یزدانی: ۶۲)

معرفتِ الٰہی کی علامت

جو شخص حق تعالیٰ سے واقف ہوجاتا ہے، اس کے قلب سے دنیا اور آخرت اور حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ تیرا وعظ خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو ورنہ گونگا بنا رہنا ہی تیرے لیے بہتر ہے۔ ضروری ہے کہ تیری زندگی حق تعالیٰ کی طاعت میں خرچ ہو ورنہ تیرے لیے موت بہتر ہے۔ (مجلس: ۵۴، فیوضِ یزدانی: ۳۱۵)

اسلام رو رہا ہے

صاحبو! (غور کرو) اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظلم سے جوان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے۔ اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کر کہ امر و نہی بھی کرتے تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے اور دفعۃً انتقال پا کر ایسے ہوگئے گویا ہوئے بھی نہ تھے۔ تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کرنے اور کھیتی، مویشی کی نگہبانی و مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کیا کرتا ہے اور اسے دیکھ کر خوشی کے مارے کھلاڑیاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دونوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو مقصود ہے، نہ تو اسی کو پورا کرتا ہے اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کا حکم رد کرتا ہے اور اس کی حدودِ شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔ (مجلس: ۶۲، فیوضِ یزدانی: ۵۲۸-۵۲۷)

شیخ جیلانیؒ کی گیارھویں شریف

بے شک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ ایک بڑے بزرگ ہیں، جن کی عظمت و محبت ایمان کی علامت ہے اور بے ادبی و گستاخی کرنا گمراہی کی دلیل ہے، لیکن اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام مخلوق میں انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب سے بڑا ہے، اور انبیاء میں سب سے افضل ترین آنحضرت ﷺ ہیں، پھر خلفاءِ راشدینؓ اور ان کے بعد عشرۂ مبشرہ و باقی ماندہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا درجہ بدرجہ مقام ہے۔ بہ غور سوچئے کہ انبیاء اور صحابہؓ جیسی مقدس ہستیوں کا ''یومِ وفات'' منانے کی شریعت نے کوئی تاکید نہیں کی تو شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ جیسے ایک ولی کا یومِ وفات منانے کا کیا مطلب؟

ویسے بھی دن منانا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں، کیوں کہ

مراتب ودرجات کا لحاظ کر کے سب سے پہلے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور سال کے کل ایام تین سو چون یا تین سو ساٹھ ہیں، تو سب کے ایام وفات منانے کے لیے مزید دن کہاں سے لائیں گے؟ اور انبیاء کرامؑ وصحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر ان سے کم اور نیچے کے درجے والے بزرگوں کے دن منائے جائیں تو یہ انبیاءؑ وصحابہؓ کے مراتب میں رخنہ اندازی ہے۔

اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی تاریخِ وفات میں بڑا اختلاف ہے۔ "تفریح الخاطر فی مناقب شیخ عبدالقادر" میں آٹھ اقوال بیان کیے گئے ہیں: ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں، گیارہویں اور سترہویں ربیع الاول اور اس کے بعد لکھا ہے کہ صحیح دسویں ربیع الاول ہے۔

اس اختلاف سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ کے خلفاء ومریدین ومتبعین نے بھی آپؒ کی تاریخِ وفات اور دن وماہ کی تعیین کے ساتھ برسی اور یومِ وفات منانے کا اہتمام نہیں کیا ہے ورنہ تاریخِ وفات میں اتنا شدید اختلاف نہ ہوتا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ بزبانِ خود فرماتے ہیں: ''اپنے آقا کی خوشنودی سے محروم ہے وہ شخص جو اس پر تو عمل نہ کرے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس میں مشغول رہے، جس کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہی اصل محرومی ہے۔'' (فتاویٰ رحیمیہ جدید: ۲/۷۷-۷۶ بتصرف، ترتیبِ صالح)

bin.yameen86@gmail.com

☆☆☆

مرکز ثقافت و تحقیق
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی مطبوعات
از: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

۱۔ **الادب الاسلامی رویہ و تاریخ**
-ادب اسلامی کی تاریخ اور نظریہ کی تشریح وتفہیم پر مشتمل ایک بنیادی کتاب۔

۲۔ **نفحات من الادب الاسلامی**
-ادب اسلامی سے متعلق مقالات۔

۳۔ **مختصر تاریخ ثقافت اسلامی**
-ایک مختصر مگر جامع کتاب جو اسلامی ثقافت سے روشناس کرانے کے ساتھ سینکڑوں باکمال شخصیات کا تعارف کراتی ہے۔

۴۔ **اسلامی افسانوی ادب**
-اردو زبان میں پہلی بار ادب اسلامی کی تفہیم وتشریح کی فنی کوشش، جس سے ادب اسلامی کے ساتھ افسانوی ادب کے مقصد ومنہج اور خصوصیات کو سمجھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

۵۔ **موقف الشیخ ابی الحسن من الافکار المعاصرۃ** (محدود نسخے)
-عالمی کانفرنس کے عربی مقالات کا بے مثال مجموعہ۔
-مفکر اسلام اور ان کے افکار پر شائع ہونے والی منفرد کتاب۔

۶۔ **مفکر اسلام ایک مطالعہ**
-ایک بے مثال اور عملی زندگی کے لئے رہنما کتاب۔

۷۔ **آئینہ افکار**
-مدیر ندائے اعتدال کے اداریوں اور مقالات ومضامین کا مجموعہ۔

۵۰٪ فیصد رعایت کے ساتھ دستیاب

رابطہ کریں:
09627961774

مقالات

تحریک پیام انسانیت
اور مولانا علی میاںؒ کی کوششیں

انیس چشتی، پونہ
aneesahmedchisti@gmail.com, 9890087779

نوٹ: معروف اسلامی اسکالر جناب انیس چشتی صاحب نے یہ مقالہ 'علامہ ابوالحسن علی ندویؒ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ، کے زیر اہتمام منعقد سہ روزہ عالمی کانفرنس ۲۲ر تا ۲۴ر فروری ۲۰۱۴ء کے درمیان ایک مؤقر مجلس کے سامنے پیش کیا۔ اس کانفرنس کا مرکزی موضوع ''معاصر مسائل اور مولانا علی میاںؒ کا موقف (تقابلی مطالعہ)'' تھا، اس کانفرنس میں ان ۵۴ مندوبین نے شرکت کی جو دنیا کے مختلف ۱۵ ممالک سے تشریف لائے تھے، اردو کے مقالات کا مجموعہ انشاءاللہ جلد ہی منظر عام پر آئے گا، لیکن افادۂ عام کی غرض سے یہ مقالہ اس سے قبل ہی شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کے فہم و ادراک کے لئے اب تک صرف عالمِ اسلام میں ہی نہیں بلکہ سارے عالم میں متعدد مذاکرے، علمی مباحثے اور فکری جلسے منعقد ہو چکے ہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر تا دمِ تحریر، مولاناؒ کے فکر و فلسفے، ادب و انشاء، حیات و خدمات، جذبات و احساسات، تاریخ و سیرتؐ نگاری، سماجی و سیاسی افکار اور روحانی و وجدانی بلندیوں کا پورے طور پر احاطہ نہیں ہو پایا ہے، مولاناؒ علم کا سمندر تھے، لیکن خود کو ادنیٰ طالبِ علم کہا کرتے تھے، قوموں کی تاریخ اور ملتوں کی تہذیبیں و ثقافتیں (۱) انہیں از بر تھیں، لیکن کوئی تجزیہ مکمل کر لینے کے باوجود بھی یہ کہتے کہ 'ہزار بادۂ ناخوردہ، در رگِ تاک است'۔

اب تک دنیا میں جتنے بھی سماجی، سیاسی، صنعتی یا تہذیبی انقلابات آئے، ان میں سے اکثر انقلابات ادب اور لٹریچر کے مرہونِ منت رہے ہیں، آج کا سائنسی اور ٹکنالوجکل، یہاں تک کہ بایو (BIO) اور نینو (Nano) ٹیکنالوجی کا انقلاب بھی بچوں کے ادب ۲ اور افسانوی لٹریچر ۳ کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اٹلی، فرانس، اسپین اور پھر انگلستان میں چودھویں صدی کے وسط سے سولہویں صدی کے آخر تک پیدا شدہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) دراصل بوکاشیو [1313ء تا 1375ء]، پیٹرارچ Petrareh [1304ء تا 1375] اور پھر بعد میں ولیم شیکسپئر [1616ء تا 1664ء]، ولیم ورڈس ورتھ [1770ء تا 1850ء]، سیموئیل ٹیلر کالرج S.T. Coleridge [1772ء تا 1834ء] اور چارلس لیمب [1775ء تا 1850ء] وغیرہ کی شاعری، ڈرامہ نگاری اور تصنیفی سرگرمیوں کی مرہونِ منت رہی ہے، 1789ء میں فرانس میں برپا ہونے والا خونیں انقلاب والٹیئر اور روسو کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح چھاپہ خانے کی ایجاد اور میڈیا

کی ترقی دراصل ادباء، شعراء اور مصنفین کی تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے کی جانے والی کوششیں ہیں، مصر میں 'اخوان المسلمون' دراصل سید قطبؒ، حسن البناء اور عبدالقادر عودہ شہیدؒ وغیرہم کی فکر اور لٹریچر کی پیداوار ہے، مولانا مودودیؒ کے لٹریچر نے جماعتِ اسلامی جیسی تنظیم اور تحریک کو جنم دیا۔ دنیا بھر میں پایا جانے والا انقلاب بھی قرآن و حدیث کی معجز بیانی اور مسحور کن لفظیات کا شاخسانہ ہے۔

لٹریچر میں اگر اتنی توانائی ہے کہ وہ تنظیموں، تحریکوں اور حکومتوں کو جنم دے سکے تو مولاناؒ کے لٹریچر میں بھی یقیناً وہ روح اور توانائی ہے کہ وہ تحریکوں اور تنظیموں کو جنم دے سکے۔ یقیناً مولاناؒ کے لٹریچر کے نتیجے میں یہ سب کچھ وجود میں آیا۔ عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی، ردّ قادنیت، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مسلم مجلسِ مشاورت، دینی تعلیمی کونسل کا احیاء، مکاتب اور مدارس کا قیام، تعلیمی اداروں میں مشرکانہ قوانین کے نفاذ کے خلاف جہاد[۴]، یہ اور ایسی لاتعداد تحریکیں ہیں جن کے وجود میں مولاناؒ کی بے چینی، ان کے نفس کی گرمی اور ان کی عظیم فکر کو بڑا دخل ہے۔ لیکن ان تمام تحریکوں میں جس تحریک کا سہرا کلی طور پر مولاناؒ کے سر جاتا ہے وہ ہے تحریک پیامِ انسانیت، جی ہاں! کل ہند تحریک پیامِ انسانیت۔[۵]

اہل اللہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کاموں کے انبار میں سے ایک ایسے کام کو ترجیحی طور پر اختیار کر لیتے ہیں، جس کی جانب کسی کا ذہن بھی نہیں جاتا۔ یہ خصوصیت انہیں انبیاء سے ورثے میں ملتی ہے۔ مثلاً مدینۂ منورہ میں مہاجرین کی آمد کے نتیجے میں جو معاشی Crisis پیدا ہوگیا تھا اسے نبی کریمؐ نے ایک سکنڈ میں 'مؤاخات' کے ذریعے دور کر دیا، یہ کوئی روحانی، فقہی یا شرعی بندوبست نہ تھا بلکہ خالصتاً سماجی، معاشی (Socio-Economic) بندوبست تھا۔ اس کے فی البدیہہ (Spontaneous) اور فوری (Urgent) ہونے کی Testing آج بھی آپ اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے ایک ایسے ماہرِ معاشیات (Economist) سے رابطہ کیجئے جس نے سیرت یا اسلامی تاریخ بالکل نہ پڑھی ہو اور اس کے سامنے اس وقت کے مدینے کی کیفیت پوری تفصیلات کے ساتھ رکھ دیجئے اور کہیے کہ ''عہد نبویؐ میں تمام راستے مسدود ہیں، تاہم آپ اپنے تجربے سے اس معاشی بحران کا حل ایک سیکنڈ میں نکالیے''۔ تب آپ کو پتہ چلے گا کہ کتنی کمیٹیاں، ذیلی کمیٹیاں، سیمینار، سمپوزیم، میٹنگیں، کانفرنسیں اور کنونشنز کی وہ شخص سفارش کرتا ہے، جن کے اخراجات میں ہی ایک نئے Crisis کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہوجائے گا اور نتیجہ صفر نکلے گا۔ لیکن نبیؐ کی ذاتِ اقدس نے یہ فریضہ بہ چشم زدن حل کر لیا، جو غزوۂ بدر پر منتج ہوا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ملک میں پھیلی ہوئی انارکی، لاقانونیت، قتل و غارتگری، حیوانیت، کرپشن، عریانیت، کالا بازاری، انسان سوزی، حکمرانوں کی بے حسی اور عوام کی بے بسی وغیرہ کے مقابلے کے لیے سن ۱۹۴۷ء میں ہی تن تنہا علم جہاد بلند کر دیا تھا۔ پھر ۱۹۷۴ میں الہ آباد میں اس میں نئی روح پھونکی گئی اور پھر یوں ہوا کہ ؎

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

رگِ ساز میں جب تک صاحبِ ساز کا لہو رواں نہیں ہوتا، تب تک بات نہیں بنتی۔ مولاناؒ کی شخصیت کی ہمہ گیریت کو اگر ہم اقل ترین خصوصیات میں بیان کرنا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہوگی:

۱۔ مروت (رواداری)

۲۔ نیک نیتی (اخلاص)

۳۔ بے نفسی (للّٰہیت)

تحریک پیام انسانیت میں مولاناؒ کی یہ تینوں خصوصیات یکجا ہوگئی تھیں۔ اکثر بڑے دانشوروں میں پائی جانے والی (Hypocricy) مولاناؒ کو چھوکر بھی نہیں گذری تھی۔ وہ تحریک پیامِ انسانیت کا کام مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کے لئے نہیں کررہے تھے بلکہ وہ پورے ملک میں انسانیت نوازی کے خواہاں تھے۔ سن ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں پورے ملک میں سکھ مخالف فسادات پھوٹ پڑے۔ رائے بریلی مولانا کا وطنِ عزیز، اندرا گاندھی کی الیکشن Constituency جہاں سکھ برادری بھی بڑے پیمانہ پر آباد ہے۔ یہاں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی سکھوں کو لوٹ ڈالا۔ مولاناؒ بے چین ہو گئے۔ مفتیوں کے فتوے اور حکومتوں کے آرڈیننس بہت نکلتے ہیں، لیکن مولاناؒ نے ملک کے بظاہر ایک کوردہ مقام سے ایک حکم جاری کیا کہ ''یہ حرام ہے، جس گھر میں لوٹ کا مال ہوگا، وہاں اللہ کا عذاب آئے گا'' اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کا ضمیر جاگا۔ انہوں نے اپنی انا اور نام نہاد عزت کی پرواہ کیے بغیر لوٹا ہوا مال سکھوں کو لوٹانا شروع کردیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی اس عمل میں حصہ لیا۔ آج یہ باتیں خواب و خیال لگتی ہیں لیکن رائے بریلی کے آسمان نے یہ منظر دیکھا ہے۔ سکھ برادری آج تک مولاناؒ کے اس تاریخ ساز حکم کو یاد کرتی ہے۔

سن ۱۹۸۶ء کی وہ صبح مجھے بھلائے نہیں بھولتی جب ندوے کے مہمان خانے میں میری طلبی ہوئی - ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے علاوہ اور بھی چند احباب وہاں موجود تھے۔ بالکل نجی مجلس تھی وہ۔ مولاناؒ نے تحریک کا جائزہ لیا اور پھر کچھ کہا، پھر کچھ کہا اور ہم نے دیکھا کہ مولانا کی آواز بھرا گئی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ وہ ہم سے وقت کا چندہ طلب کررہے تھے۔ اور ہم تھے کہ مولانا کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکتے تھے میں نے اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ مولانا کو روتے دیکھا تھا۔ میں لرز گیا۔ نوجوانی کی باعزت ملازمت، نوزائدہ عائلی زندگی۔ جی چاہتا تھا کہ 'صلیب و دار کی حد سے گذر جاؤں' اور جدھر جاتا نہیں کوئی ادھر نکل جاؤں۔ لیکن یہ سب کچھ تو ہوا نہیں۔ البتہ مولانا کی اس پکار نے جو سو رہے تھے انہیں جگا دیا، جو لیٹے تھے انہیں اٹھا کر بٹھا دیا۔ جو بیٹھے تھے انہیں کھڑا کر دیا، جو کھڑے تھے انہیں چلتا کر دیا اور جو چل رہے تھے انہیں دوڑا دیا، گاؤں گاؤں، شہر شہر، قریہ قریہ تحریک پیام انسانیت کی کارنر میٹنگیں، مجلسیں، ہندو مسلم مشترکہ اجلاس، کانفرنسیں اور سمپوزیم ہونے لگے۔ اے انہیں دنوں سید حامد صاحب کی ایماء پر تحریک پیام انسانیت میں ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر اجلاس میں بڑے پیمانے پر ہندو، مسلم، سکھ، جین، بدھسٹ

اورعیسائی دانشوراور پالیسی سازشریک ہوتے۔اور یہ سلسلہ گلی کوچوں سے ہوتا ہوا پارلمنٹ انیکسی، وگیان بھون اور کانسٹی ٹیوشن کلب پر منتج ہوا۔

اسی طرح کےایک ڈائیلاگ کے بعد میں نے ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے(1902ءتا1998ء) کا پیچھا پکڑلیااورمولانا کی اجازت سے اسی تحریک کا ایک کل ہندسطح کا دانشوروں پر مشتمل ایک Wing وجود میں آ گیا۔ اس کی صدارت پانڈے صاحب اور جنرل سکریٹری سی بی ترپاٹھی (مائنا ریٹی کمیشن، دہلی)اورسکریٹری کےفرائض راقم الحروف اور قاضی عبدالحمید صاحب اندوری کے ذمےآن پڑے ۸؎اس سوسائٹی فارکمیونل ہارمنی، میں سابق پرائم منسٹرآئی کے گجرال، سریندر موہن، ربی رے، پی این ہکسر، اوپیندر باجپائی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، گوپی چند نارنگ، گورنر صادق علی، کلدیپ نیر، پی دین دھرگیس، عبدالمنان، محمد ادیب (موجودہ ایم پی)لا مالوب ژنگ ۹؎ جیسے ملکی اور عالمی شہرت یافتہ افرادمنتخب کیے گئے۔ اس سوسائٹی نے قومی یگانگت اور ہندومسلم اتحاد نیز انسانیت نوازی کی سمت میں بڑےمثبت پروگرام کیے۔

مولانا کی زندگی میں خود داری اور مفاہمت کا حسین امتزاج تھا۔ وہ مفاہمت کے نام پر ملت، دین، ایمان اور عزت نفس کا کوئی سمجھوتہ کرنے کے بالکل قائل نہ تھے، یہ خصوصیت ان کے تربیت یافتگان کی خاص پہچان ہے۔ مفاہمت کے اسی امتزاج نےتحریک پیام انسانیت کو وحدتِ ادیان اور'ایشورکو پانے کے لئے انیک راستوں میں سےایک راستہ اسلام بھی ہے،جیسی فکرکو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔لوگ نبی کریمؐ کی سنت کوصرف نماز، روزہ، حج، زکوۃ،قربانی اورنکاح میں تلاش کرتے ہیں۔ان کا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا کہ لکم دینکم ولی دین، صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ، بنونجران، بنوغادیان، اہل مقنا، اہل اذرم وغیرہ کے عیسائی اور یہودی قبائل کےساتھ امن معاہدات،بھی عین سنت ہیں،تحریک پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ ڈائیلاگ محض ایک رسم ہی نہیں، بلکہ اسی سنت کی ادائیگی کا ایک حسین اعادہ ہیں۔

بنگلور کےشری ستیہ سائیں بابا کا نام کس نےنہیں سنا۔ان کی منفی روحانیت نے ایک عالم کو متأثر کر رکھا تھا۔ انڈیا ٹوڈے جیسے وقیع اخبار نے اپنے کئی شمارےان کے کرتوتوں کا پردہ فاش کرنے کی نذر کیے تھے۔ وہ ہوا میں ہاتھ بلند کرتے اور بھبھوت بھکتوں کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ ان کے جادوئی نذرانے بھکتوں کے حسبِ حیثیت ہوا کرتے تھے۔ بڑے لوگوں کو سونے چاندی اور ہیرے کی انگوٹھی۔صنعتی گھرانوں کی خواتین کو مالائیں اورکنگن وغیرہ۔ اپنے بنگلور کےایک سفر میں حضرت مولاناؒ، پرنسپل میرجعفر کی ایماء پرایک وفد کےساتھ ۱۹۷۹میں ان سے ملنے گئے تھے۔اس وفد میں پرنسپل میر جعفر، مولا نا اسحٰق جلیس ندویؒ، مولاناؒ کے بھتیجے مولانامحمد میاںؒ اورمولانا عبدالکریم پاریکھؒ وغیرھم شریک تھے۔ سائیں بابا سے ملاقات کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا عرض کردیں کہ مولاناؒ اوران کے وفدکو دیکھتے ہی سائیں بابا نے اپنا پہلا ہی وارمولاناؒ پر یہ کہہ کر کر دیا کہ''آپ کی بائیں آنکھ پتھر کی ہے'' یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولاناؒ کا

ابھی امریکہ میں آپریشن نہیں ہوا تھا اور آپؒ عدم بصارت کے سخت مرحلے سے گذر رہے تھے۔ مولاناؒ نے اسی وقت سائیں بابا کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ ''دیکھیے! ہم آپ کے پاس آنکھ کے ڈاکٹر کی حیثیت سے آنکھ کا علاج کروانے نہیں بلکہ ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے آئے ہیں.....'' اس ملاقات میں مولاناؒ نے اپنی آمد کا مقصد، ملک کے بگڑتے ہوئے حالات اور فریقین کی ذمہ داریوں سے متعلق مفصل گفتگو کی، اس پورے مرحلے میں سائیں بابا وفد پر اپنی منفی توجہ ڈالتے رہے۔ ان کا جادو کام کر گیا۔ چند دنوں کے اندر اندر ملت کے دو جواں سال قائدین یعنی مولانا محمد میاں اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی پندرہ دن کے فرق سے آگے پیچھے سخت تکلیف دہ عارضے سے وفات پا گئے۔ اخیر تک پتہ نہ چل سکا کہ عارضہ کیا ہے؟ پرنسپل میر جعفر صاحب بھی بہت ہی جلد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا پاریکھ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''ایک عرصے تک مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئلے کے انبار مجھ پر چلے آرہے ہوں'' خود حضرتؒ نے فرمایا کہ ''ہم بنگلور شہر میں جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے، وہاں بھی ہم سائیں بابا کے اثرات محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کا آشرم دوسرے شہر میں کافی فاصلے پر تھا[۱۰]۔

اس پورے واقعے میں بڑی تفصیلات ہیں، انہیں چھوڑ کر ہم اصل مرحلے کی طرف آتے ہیں، وہ یہ کہ برّی افواج کے ایک جنرل چھبرؔ سائیں بابا کے بڑے بھکت تھے جنرل کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک عام آدمی نہیں لگا سکتا۔ جنرل چھبر کے دور اقتدار میں سائیں بابا کا فوج میں آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا۔ انہیں سائیں بابا نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ایک انگوٹھی بھی عنایت کی تھی جو شاید پلاٹینم کی تھی۔ یہ انگوٹھی جنرل نے خود مجھے بتائی تھی۔ فوج میں سائیں بابا کو وہی آئی پی پروٹوکول میسر تھا- ان کی سواری گذرتے وقت پورا ٹریفک روک دیا جاتا تھا۔ انہیں پہلی بار میں نے کشمیر میں ہی دیکھا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ جنرل چھبر ریٹائر ہو گئے۔ ایک دن سدرن کمانڈ کے ایک اعلیٰ افسر کا مجھے ٹیلی فون آیا کہ جنرل چھبر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں میری مصروفیت یہ بھی تھی کہ برّی افواج کے اعلیٰ افسران کو دوران تربیت اسلامی علوم، قومی یکجہتی اور وطن کی محبت کے اسباق پڑھاؤں- دوسرے دن فوجی گاڑی آئی اور مجھے جنرل چھبر سے ملاقات کے لئے لے گئی۔ کئی دنوں تک اور وقفے وقفے سے کئی ماہ تک ہماری میٹنگیں ہوتی رہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ افسران کی تربیت کے لے فوجی یونیورسٹی میں ہم نے جو کورس بنایا تھا وہ دراصل شری سائیں بابا کی ایماء پر ہی شروع کیا گیا تھا اور اس میں یہ فکر حاوی تھی کہ اگر ملک کو متحد رکھنا ہے اور افواج کے سیکولر مزاج کو مستحکم کرنا ہے تو افسران کو تمام مذاہب کے تقابلی مطالعے پر آمادہ کرنا ہوگا۔ جنرل چھبر نے بڑی کوششوں کے بعد یہ کورس جاری کروایا تھا۔ اور اب وہ چاہتے تھے کہ اس کے نصاب میں ایسی تبدیلی کر دی جائے کہ وہ مذہب کو زندگی سے قریب کر دے۔ متعدد میٹنگوں میں یہ اندازہ لگانا بہت آسان تھا کہ ایک مذہبی پیشوا اور فوج کے اعلیٰ ترین سربراہ کے ذہن میں یہ بات مولاناؒ سے اُس ملاقات کے بعد ہی آئی تھی جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے۔ مولاناؒ غیر مسلموں سے جس بلند سطح سے گفتگو کیا کرتے

تھے اور تحریک کی ضرورت اور مقاصد کو جس انداز میں پیش کیا کرتے تھے، اس سے انبیاء کرامؑ کے دعوتی اسلوب کے واقعات دل میں تازہ ہو جاتے تھے۔

کسی فوجی یونیورسٹی میں جاری کیا جانے والا یہ کورس اب تک سارے عالم میں اولین ہے۔ کسی فوجی افسر کے عہدے میں ترقی کے لئے اسے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ راقم نے نائن الیون ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے اپنے سرکاری دورے میں جب ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹ (وزارت خارجہ) میں اس کا ذکر کیا تو وہ لوگ بھی حیرت زدہ ہو گئے۔[۱۱]

ہر ملک میں مصلحین نیز سماجی اور سیاسی ورکروں کی ایک فوج ہوا کرتی ہے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود یہ قائدین مقامی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے۔ اس فہرست میں بڑے بڑے نام آتے ہیں جو صرف اپنے ملک کے ہو کر رہ گئے۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کو ملکی سطح سے بلند کر کے اسے ہمیشہ عالمی بنائے رکھا۔ وہ کبھی چھوٹی چھوٹی بحثوں اور مذہبی رقابتوں میں نہیں الجھے۔ بابری مسجد کے قضیے کو وہ صرف ملک کے لئے ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ اس شدید مسئلے میں مفاہمت کا جو فارمولہ انہوں نے تیار کیا تھا ملک کے چند ناعاقبت اندیش لیڈر اسے تسلیم کر لیتے تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا[۱۲] مولاناؒ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ نجی مجلس میں جو بات کہتے، وہی پالیسی ان کے عوامی جلسوں، میڈیا کے لوگوں اور دیش کے نیتاؤں کے سامنے بھی ہوتی۔ نصف شب کو بھی کوئی اٹھا کر ان سے تحریک کے بارے میں پوچھتا تو شاید وہ صرف اور صرف عالمی امن کی بات کرتے۔ میں نے مولاناؒ کے قریب رہ کر بڑے وزراء، عرب اور ترکی شیوخ، ترکی وزیر اعظم، ملک اور بیرون ملک کے دانشوروں اور اخبار نویسوں سے ان کی گفتگو سنی ہے۔ وہ ہر فساد، ہر قتل عام اور ہر ناانصافی پر وہی پالیسی اختیار کرتے جو 'عالم انسانیت' کے لئے مفید ہوتی۔

ایک مرتبہ فلسطینی طلبہ اور اساتذہ کا ایک وفد مولاناؒ سے ملنے آیا[۱۳]۔ ان کے بیانیے نے ہمیں آبدیدہ کر دیا۔ مولاناؒ ساکت و صامت بیٹھے رہے۔ سب یہ سمجھے کہ مولاناؒ ابھی جہاد کی فضیلت پر تقریر شروع کریں گے، لیکن مولاناؒ کی نظر میں ہر فرد، ملت کے مقدر کا ستارہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اس چھوٹی سی مجلس کو عالمی ہی نہیں کائناتی بنا دیا۔ وہ ہمیں دور رسالتؐ میں لے گئے اور پوچھا کہ ''کیا نبی کریمؐ کے ہاتھ پر یہودی ایمان نہیں لائے تھے؟ کیا آپؐ نے ان تک دعوت اسلام نہیں پہنچائی تھی؟ کیا آپؐ نے انہیں انسانیت کا درس نہیں دیا تھا؟ کیا ہم اسرائیلیوں کے درمیان یہ فریضہ انجام دے چکے ہیں؟'' اس وقت مولاناؒ نے تاریخ کے صفحات سے ایسے متعدد صحابہ کا ذکر کیا جو یہودی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت مولاناؒ نے ایک بڑی معرکۃ الآراء بات کہی وہ یہ تھی کہ ''اتمام حجت کے بغیر خدا کی نصرت کی امید نہیں رکھنی چاہیے[۱۴]''۔ اس دعوے کی دلیل کے لئے مولاناؒ نے متعدد تاریخی حوالے بھی پیش کیے۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ سخت ترین حالات میں بھی 'تحریک پیامِ انسانیت' سوئے ہوئے انسانوں کو جگانے کا مؤثر ترین اور محفوظ ترین اسلوب ہے۔ تحریک انتفاضہ کے قائلین نے پہلی مرتبہ تحریک

انسانیت، کا درس لیا تھا، ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور شاید ان کی نظر میں 'یہودی بھیڑیے' ایک ایسی مخلوق میں تبدیل ہو گئے جو اب تک دعوت کی گرمی اور انسانیت نوازی کی سرگرمی سے محروم تھے۔ تھوڑی دیر بعد حضرتؒ مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ ''انہیں باہر ہال میں لے جایئے اور تحریک سے متعلق تفصیلات سے انہیں آگاہ کیجیے اور فلسطین میں تحریک کے کام کا نقشہ بنا کر دیجئے ۱۵''

راقم الحروف ۱۹۷۲ء سے مولاناؒ سے اور سن ۱۹۷۴ء سے تحریک سے باقاعدہ وابستہ رہا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے، جب 'شیلا نیاس' کی ملک دشمن کارروائیوں نے پورے ملک میں کہرام مچا رکھا تھا، مجھے مولانا کا خط لے کر ملک کے سارے بڑوں، یعنی وزیر اعظم، وزیر داخلہ سے لے کر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، ایم پیز، ایم ایلیز، مصنفوں، اخبار نویسوں، بیوروکریٹوں، غرض کہ چوٹی کے غیر مسلموں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مرکز میں بھی اور ریاست میں بھی ۱۶، بعض مرتبہ ٹرینوں اور اسٹیشنوں پر ہو کا عالم ہوا کرتا تھا اور بعض مرتبہ کارسیوکوں کی یورش سے کبھی بھی، کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا تھا، لیکن خدا کے ایک محبوب بندے، سچے محبِّ وطن اور مخلص ترین انسانیت دوست فقیر کے خط کی کا پیاں ہم سینے سے لگائے، آگ میں سے بھی گذرنے کو تیار رہتے تھے۔ اس طویل خط کا نام ہم نے تعویذ رکھ چھوڑا تھا۔ جہاں Appointment نہ ملتا تھا وہاں خط لے کر ہم ڈائرکٹ پہنچ جاتے – اور دروازے خود بخود کھل جایا کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں سے اتنا ضرور ہوا کہ نام نہاد سیاستدانوں کی جو رہی سہی کسر دل میں باقی تھی، اب وہ بھی نہ رہی، اس نڈر پن سے ہم نے بعد میں بڑے بڑے کام لیے۔ ۱۷

اسی بے باکی کا مظہر وہ شعبہ ہے جو ہمارے احباب کی کوششوں سے بعد میں ناگپور یونیورسٹی میں قائم ہوا۔ اس شعبے کا مرکزی خیال ہی 'تعلیمی عمل میں انسان دوستی اور پیام انسانیت' ہے۔ کسی ایسے شہر میں جہاں سنگھی ساتھیوں کا مرکزی دفتر ہو، یہ شعبہ قائم کرنا آسان کام نہیں۔ جب کہ ملت ایسے کاموں پر پانچ روپے بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں کیوں کہ یہ سب کچھ ان کی سمجھ سے بالاتر کسی شے کا نام ہے۔ ۱۸

مولاناؒ ہر بات میں مفاہمت کر لیتے، لیکن ایمانیات، عقائد، عبادات اور حرام و حلال میں کسی قسم کی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ تحریک پیامِ انسانیت کا کوئی تنظیمی ڈھانچہ مولاناؒ نے نہیں بنایا تھا اور نہ ہی اس تحریک کا کوئی بجٹ ہے۔ اس کے تمام اخراجات آج بھی ہم اپنے صرفِ خاص سے پورے کر رہے ہیں، اسی وجہ سے یہ تحریک ملک میں چل تو رہی ہے لیکن دوڑ نہیں رہی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ہم نے پونہ میں تحریک کا بہت بڑا کنونشن بلایا تھا، جس میں بڑے پیمانے پر غیر مسلم دانشور شریک ہونے والے تھے۔ چادر چھوٹی تھی اور پیروں کا باہر نکلنا یقینی تھا۔ ہم نے یہ بھی سوچا تھا کہ تمام شرکاء کو ایک خوبصورت Folder دیا جائے جس میں تحریک کا لٹریچر مراٹھی اور انگریزی زبانوں میں چھپوا کر رکھا جائے۔ مالیے کی قلت سے میں بہت پریشان تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی بنک ۱۹ کے ایک ڈائرکٹر ۲۰ نے مجھ سے کہا کہ ''وہ مسلمان جو سود نہیں لیتے، ان کی بہت ساری

رقم ہمارے پاس جمع رہتی ہے۔ اگر آپ عریضہ دیں تو ایک بڑی رقم آپ کو مل سکتی ہے'' میں نے کہا ''مولاناؒ سے پوچھ کر بتاتا ہوں'' میں نے مولاناؒ سے فون پر رابطہ قائم کیا، جواب ملا کہ ''دعوتی کاموں میں سود اور دیگر ناجائز طریقوں سے حاصل کردہ ذرائع سے برکت نہیں رہتی۔ جو کچھ کرنا ہے پاک کمائی سے کرو'' اس وقت پتہ چلا کہ آج دعوتی کاموں میں برکت کیوں نہیں رہی۔

آج فروری 2014ء ہے۔ جون تک بھارت کا سیاسی مطلع صاف ہوجائے گا۔ آج لوگوں کو ''کون بنے گا وزیر اعظم؟'' کی فکر ستائے جارہی ہے، لیکن افق سے اس پار کوئی دیکھنے کو تیار نہیں کہ مستقبل میں بھارت ایک سپر پاور بن کر ابھرنے والا ہے۔ ستمبر تک اس کا مصنوعی سیارہ امریکہ کے مصنوعی سیارے سے دس گنا کم لاگت میں مریخ پر اتر چکا ہوگا۔ شمسی توانائی کے ذریعے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچ چکی ہوگی۔ سڑکیں، میٹرو اور گھروں میں بیت الخلاء کی سہولتیں عام ہوں گی۔ ممکن ہے ہمارا بھارت امریکہ اور چین سے بھی زیادہ طاقتور ملک بن جائے۔ لیکن آج دنیا کے زیادہ تر ممالک اخلاقی قیادت کی تلاش میں ہیں۔ روس کے ساتھ اشتراکی نظام کب کا بکھر چکا۔ امریکہ اپنے نظریاتی دیوالیہ پن، رشوت ستانی اور جنگ پسندی کی وجہ سے ایک مقتول شرابی کی لاش کی طرح چوراہے پر پڑا ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک نام نہاد تکنیکی، تفریحی، معاشی اور عریانیت کی دلالی میں مصروف ہیں۔ ساری دنیا کے ممالک چین کو اس کی ظالمانہ توسیع پسندی کی وجہ سے رد (Reject) کر چکے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا امن و بلند اخلاقی قدروں کی متلاشی ہے۔ مولاناؒ ہندو مسلمانوں کے مشترکہ جلسوں میں انہیں للکارتے اور کہتے کہ ''تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے تم سے کہتا ہوں کہ ملک بہت تیزی سے اخلاقی زوال کی طرف جا رہا ہے'' وہ کہتے کہ ''میں تم سے ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ.....!'' اور مائکروفون پر شہادت کی انگلی ٹھونک کر کہتے کہ ''.....اور یہ بھی ایک ڈنکا ہے''۔ اور واقعی پورا آڈیٹوریم گھن گرج کے ساتھ لرز جاتا اور فرماتے کہ ''افسوس! آج پورے ملک میں گاندھی کی سطح کا بھی ایک آدمی نہیں ہے جو ملک کی اس گرتی ہوئی دیوار کو سہار سکے''۔ مولاناؒ کی تقریر سے سامعین پر لرزہ طاری ہوجاتا۔ لوگ تحریری ۲۱ وعدے کرتے اور کاموں کے لیے تیار ہوجاتے۔

نہ کارواں ابھی گذرا ہے اور نہ غبار ہی ابھی بیٹھا ہے۔ مولانا کی آواز صدیوں تک اس ملک میں سنی جاتی رہے گی۔ وہ روشنی کی ایک سنہری لکیر ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں۔ جو اسے تھام لے گا فلاح پائے گا۔ اگر ملک تھام لے گا تو وہ دنیا جہاں کی آنکھوں کا تارہ بن جائے گا، ورنہ: مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ اسے۔

.....

حواشی:

۱۔ تفصیلات کے لئے مولاناؒ کی تصانیف: نبی رحمتؐ، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، تاریخ دعوت و عزیمت اور کاروان زندگی نیز المرتضیٰ دیکھیے۔

۲۔ کامکس (Comics)

۳۔ Science Fictions سے مراد ہے۔

۴۔ اتر پردیش میں بی جے پی حکومت کی جاری کردہ وندے ماترم اور سرس وتی وندنا وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ اس تحریک کی تفصیلات کاروان زندگی، حصہ سوم اور متعدد کتابچوں میں موجود ہے۔

۶۔ الحمدللہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

۷۔ ہم اس وقت تک کسی جلسے کو 'تحریک پیام انسانیت' کا جلسہ نہیں سمجھتے جب تک اس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم شریک نہ ہوں۔

۸۔ آنریری خزانچی کی ذمہ داری آج بھی دہلی کے عبدالمناس صاحب (کینسر انسٹی نیوٹس) ادا کر رہے ہیں۔

۹۔ یہ دلائی لامہ کے قریبی آدمیوں میں سے ہیں اور لداخ کے بدھسٹ پیشوا ہیں۔

۱۰۔ سائیں بابا کی توجہ اتنی شدید تھی کہ کوئی اور ہوتا تو ڈھیر ہوجاتا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ اس موقع پر ہم صرف درود شریف پڑھتے رہے۔

۱۱۔ تقریباً یہی بات میں نے امریکہ میں وزارت تعلیم .....

۱۲۔ بابری مسجد کے تعلق سے مولاناؒ کا موقف کیا تھا اور مسلم سیاسی قیادت نے اسے کس طرح ڈائنامائٹ کیا یہ ایک الگ موضوع ہے، اس میں بڑے بڑے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ ملاقات ضروری ہے۔

۱۳۔ یہ سن ۱۹۹۴ء یا ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔

۱۴۔ اس موقع پر حضرتؒ نے حضرت یوسفؑ اور حضرت امام حسینؓ کی مثالیں بھی دیں۔

۱۵۔ اس وفد میں ایک طالب علم ایسا بھی تھا جو اردو بول سکتا تھا۔ اس سے کام میں بہت مدد ملی۔

۱۶۔ یہ بابری مسجد سے شہادت سے پہلے کی بات ہے جب وی پی سنگھ وزیر اعظم تھے۔

۱۷۔ بابری مسجد ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو شہید ہوئی ہے اور اس ہو کے عالم میں میں تنِ تنہا لکھنو میں یوپی کے وزیر داخلہ، بیوروکریسی اور پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ۴ر دسمبر کو ملاقاتیں کر رہا تھا اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بابری مسجد کی شہادت طے ہے۔

۱۸۔ اس شعبے کا پورا نام, Post Graduate Diplomain Commaral Harmony and Social Peoce.

۱۹۔ دی مسلم کوآپریٹیو بنک لمیٹیڈ، پونہ۔

۲۰۔ الحاج عبدالقادر میمن مرحوم۔

۲۱۔ تحریک کے جلسوں میں ایک فارم دیے جانے کا رواج ہے، جس کی شہادت ایک عہد نامے جیسی ہے۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

ندوۃ العلماء اور عرب دنیا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ندوۃ العلماء کو دوسرے دینی تعلیمی اداروں پر کئی اعتبار سے شرف اولیت اور فضیلت حاصل ہے۔ ادبی اسلوب کے ساتھ جدید مستند انداز تحقیق وتصنیف ندوہ کا امتیاز خاص رہا ہے جس کا نمونہ دارالمصنفین کی کتابیں ہیں ۔تصنیف و تالیف کی دنیا میں جدید علمی اور ادبی معیار پہلے ندوہ نے قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے قدیم طرز پر پرانے رکیک و متروک اسلوب میں علماء دینی کتابیں لکھا کرتے تھے۔ پھر ندوہ کی نقل میں دارالمصنفین کے طرز پر ندوۃ المصنفین اور دیگر ادارے بھی دوسرے مدارس کے علماء نے قائم کئے ۔اور شبلی اور ان کے رفقاء کا انداز تحریر مستند ٹھہرا اور وہی معیار قرار پایا۔دوسرا معیار فضیلت ندوہ کو جدید عربی زبان وادب کے اعتبار سے حاصل ہے، ندوہ نے عربی کے نامور انشاء پرداز پیدا کئے جن کے طاقتور عربی اسلوب کا اعتراف عرب دنیا میں کیا گیا۔اس کے بعد دوسرے دینی مدارس نے بھی خاموشی کے ساتھ اس میدان میں ندوہ کا تتبع کیا اور وہاں بھی عربی کے قادر الکلام لکھنے والے پیدا ہونے لگے۔اردو میں یا عربی میں ندوہ نے جو اسلوب اور طرز اختیار کیا وہی معتبر اور جو ظرف اٹھایا ادب کے میکدہ میں وہی ساغر ٹھہرا۔مولانا عبد الماجد دریابادی دوسرے اداروں کے اچھے صاحب فکر اہل قلم کو ندوی القلم اور ندوی الفکر کہا کرتے تھے۔ بلاشبہ دوسرے مدارس سے بھی عربی اور اردو کے صاحب قلم نکلنے لگے لیکن درحقیقت یہ ندوہ کی آواز تھی جس کی بازگشت ہر طرف سنائی دے رہی تھی، ادب اور دانش کا یہ وہ آوازہ تھا جس سے گنبد مینا گونج رہا تھا۔ ندوہ نے مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی آواز اٹھائی یہ آواز بھی صدا بصحراء ثابت نہیں ہوئی۔کچھ اداروں نے اس آواز پر لبیک ضرور کہا۔ندوہ کی تحریک کے بعد دینی مدارس میں اردو اور عربی میں شگفتہ تحریروں کے لکھنے والے جدید طرز اور اسلوب کے مصنف پیدا ہونے لگے۔شورش عندلیب نے ایک روح علم وادب کے چمن میں پھونک دی تھی اور خواب غفلت میں گرفتار غنچوں کو بیدار کر دیا تھا۔

ندوۃ العلماء کو ایک اور میدان میں دوسرے دینی اداروں کے مقابلہ میں سبقت اور ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے اور وہ ہے عرب دنیا اور اس کے مسائل سے اس کا تعلق، یعنی ندوۃ العلماء عجم کا وہ ساز ہے جس کی نوا عربی رہی ہے، ندوہ نے ہمیشہ پوری عرب دنیا کو اپنی برادری سمجھا، اس درسگاہ کے فارغین عرب دنیا کے غم اور خوشی میں شریک رہے، انہیں عرب دنیا کے حالات اور مسائل سے اتنی ہی دلچسپی رہی جتنی حاضر العالم الاسلامی کے مصنف امیر شکیب ارسلان کو یا جمال الدین افغانی یا اور کسی عرب عالم اور قائد کو ہوسکتی ہے ۔اس

درسگاہ کے صاحب قلم فارغین نے تاریخ میں عرب حکومتوں پر کتابیں بھی لکھی ہیں اور عصر حاضر میں عرب دنیا کی دینی اور فکری غلطیوں پر نکیر بھی کی ہے، ندوۃ العلماء کی دینی غیرت ایک مثال نہیں بلکہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، جب قاہرہ کے چوراستوں پر جمال عبد الناصر کے عہد میں فرعون کے مجسمے نصب کئے جارہے تھے تو دنیا میں احتجاج کی پہلی آواز ہندوستان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی بلند ہوئی تھی جب مصر پر اور دیگر عرب ملکوں پر عرب قومیت کا دورہ پڑا جیسے کسی مریض پر جنون کے دورے پڑتے ہیں تو مولانا علی میاں کی مسلسل تحریریں سامنے آئیں مولانا نے ''بین العالم وجزیرۃ العرب'' اور ''اسمعی یا سوریا'' اور ''اسمعی یا مصر'' اور ''اسمعو ہا منی صریحۃ ایہا العرب'' کے عنوان سے تقریر وتحریر کے ذریعہ بار باران کو خطاب کیا۔ اردو میں ''عالم عربی کا المیہ'' اور'' اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' کے موضوعات بھی عرب دنیا سے متعلق ہیں۔ اردو اور عربی میں یہ کتابیں لکھ کر مولانا نے مسلمانوں اور عربوں کو بیدار کرنے اور باشعور بنانے کی کوشش کی، مولانا کی آواز عربوں کے لئے صور اسرافیل تھی غلط اور غیر دینی نظریات کے لئے مولانا کا قلم تیغ اصیل تھا، مولانا کی زبان ابر گوہر بار تھی، وہ ابر جو عالم اسلام پر برستا رہا اور اسلامی افکار کے چمن میں پھول کھلاتا رہا۔لیکن جس وقت مولانا کا قلم تیغ جوہر دار بن کر عرب دنیا میں غیر اسلامی نظریات کو کاٹ رہا تھا اس وقت ہندوستان کے مدرسی اور دینی حلقوں کی بے حسی بھی دیدنی تھی ایک مشہور دینی درسگاہ کے استاد نے علماء کی ایک تنظیم کی ایما پر مولانا علی میاں کی تحریروں کے جواب میں ایک کتاب لکھدی جس کا نام رکھا ''مصر جدید کا دینی پہلو'' اور دلیل کے طور پر جامع ازہر کا نام لیا اور ان قاریوں کا جو رمضان کے زمانہ میں مصر سے دنیا کے ملکوں میں بھیجے جاتے تھے۔اور یہ کتاب بھی کیوں لکھی گئی تھی؟ اس لئے لکھی گئی تھی کہ مصر کے اخبار ''الاہرام'' نے اخبار میں اداریہ لکھا تھا کہ ہندوستان کے مصر سے روابط دوستانہ اور برادرانہ اور مستحکم ہیں اور ان روابط میں اگر آئندہ کوئی رخنہ پڑا تو اس کی ذمہ داری ندوۃ العلماء سے نکلنے والے رسالہ البعث الاسلامی پر ہوگی اور پھر مصر کی حکومت نے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے باقاعدہ اس کی شکایت کی تھی ۔ یہ ہے پس منظر اس کتاب کا جو مصر کی مدافعت میں ہندوستان کے ایک دینی مدرسہ کے استاذ کے قلم سے اور علماء کی ایک تنظیم کی ایما پر سامنے آئی تھی، وہ تنظیم جو اپنی بے شعوری کی وجہ سے جمال عبد الناصر کی ہمنوا ہم آواز اور دمساز بن گئی تھی۔وہ تنظیم جو آج بھی عبد الفتاح سیسی کے ذریعہ اخوان کی حکومت کا تختہ الٹنے پر کوئی بے چینی محسوس نہیں کرتی ہے۔

افسوس یہ کہ ہمارے ملک میں اور دینی حلقوں میں ایسے علماء اور قائدین کی کمی نہیں رہی ہے جو کمال اتاترک اور جمال عبد الناصر کو اسلام کا نجات دہندہ سمجھتے رہے ہیں۔ یہ ندوۃ العلماء کی بالغ نظری اور شعور اور ادراک کی بلندی کی بات ہے کہ عالم اسلام کی تحریکات کو اس نے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی، عربی زبان کے اخبارات اور رسائل اس کے فارغین کی نظروں سے گذرتے تھے، عرب دنیا کے حالات اور مسائل پر ان کی مسلسل تحریریں سامنے آئیں، البعث الاسلامی کے ایڈیٹر مولانا محمد الحسنی نے بہت طاقتور اسلوب میں ''مصر تتنفس'' کے نام سے کتاب لکھی، جزیرۃ العرب کے تاریخ اور جغرافیہ پر مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی کتاب سامنے

آئی ،عرب ملکوں میں اسلامی بیداری کے لٹریچر پر مولانا محمد واضح رشید ندوی کتاب الصحوۃ الاسلامیۃ منظر عام پر آئی ،عہد حاضر کی اسلامی تحریکات پر پروفیسر احتشام ندوی کی کتاب شائع ہوئی ، ندوۃ العلماء کے ایک دوسرے فرزند پروفیسر رضوان احمد ندوی نے الاخوان المسلمون پر ربع صدی پہلے ایک کتاب لکھی جو پاکستان سے شائع ہوئی ، پھر جب مصر میں عرب ملکوں میں حال کے زمانہ میں انقلاب کی دستک شروع ہوئی تو پھر اسی درسگاہ کے ایک فرزند نے ''عرب دنیا کے انقلابات۔اسلامی نقطہ نظر'' اور پھر''شام جل رہاہے''اور اس کے بعد'' شام لہو لہو''اوراخیر میں ''مصر میں اخوان کا قتل عام'' کے نام سے بہت سے کتابچے لکھے اور شائع کیے اوراخیر میں محمد انظر ندوی کی کتاب''الاخوان المسلمون۔تختہ دار سے تخت اقتدار تک ''کے نام سے کتابوں کی دکان پر نظر آئی۔

بالکل اخیر میں جب مصر کی سرزمین پر موسی اور فرعون کی کشمکش کی تاریخ نئے انداز سے دہرائی جانے لگی اور والیان حرم جب اس کشمکش میں فرعون کے ہم نوا اور مخالف اسلام طاقتوں کے طرفدار بن گئے اور جب عصر حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کو اور حق کے قافلہ سخت جاں کو دہشت گرد قرار دینے لگے اور جب وہ قطر پر دباو ڈالنے لگے کہ وہ اخوان کی حمایت اور تایید سے باز رہے اور جب قطر نے ان کا دباو قبول نہیں کیا تو اس سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تو اس عبرت خیز اور الم انگیز فضا میں ہندوستاں کے اندر اہل حق اور اہل انصاف کے کارواں کی قیادت بھی ندوۃ العلماء کے غیور اور باشعور فرزندوں کے حصہ میں آئی جنہوں نے عرب دنیا کے حالات کو اپنا غم اور اخوان پر ظلم کو اپنے دل کا زخم بنایا اور اس درد کو اپنے جگر میں بسایا،(۱) کاش اردو زبان وادب اور عربی زبان وادب کے میدان کی طرح اس میدان میں بھی ندوہ کے نقوش قدم کی پیروی کی گئی ہوتی اور اعلان حق کی جرات قلندرانہ تمام علماء کو نصیب ہوتی، قرزندان ندوہ نے حق کی آواز عزم وعمل کے نازک وقت میں فرمارواپان وقت کے جاہ وجلال کی پرواہ کئے بغیر اس وقت بلند کی جب دوسرے اداروں کے بےشعور قائدین اور علماء فرعون مصر عبدالفتاح سیسی کے حق میں، یا اس کے موید وحامی خسروان سلطنت کی تایید ومدافعت میں ،مصلحتوں کا لبادہ اوڑھ کر اور امید چشم کرم پر، اخبارات میں بیان جاری فرمارہے تھے بقول احمد فراز

تمام سالک وصوفی تمام شیوخ و امام
امید لطف پر دربار کج کلاہ میں ہیں

☆☆☆

(۱) **نوٹ:** اس سلسلہ میں نمایاں نام مولانا سید سلمان الحسینی ندوی اطال اللہ بقاءہ کا ہے، فاضل صاحب قلم ڈاکٹر صاحب نے غالبا کسی مصلحت کے باعث نام درج کرنے سے گریز کیا، ورنہ سچ یہ ہے کہ اس موقع پر باطل کے خلاف محاذ آرائی اور حق کی قیادت میں واولیت ان ہی کے حصہ میں آئی، ان کی تقریروں اور مضامین نے ہندوستان میں سعودی سفارت خانہ سے لیکر امام حرم شیخ سدیس تک کو متحرک کر دیا، اور باطل کا ساتھ دینے والے تو اس طرح تلملائے کہ انہوں نے مولانا محترم کو مستقل ہدف ملامت بنالیا اور پھر تنقید نہیں بہتان والزام تراشی کی تمام حدود کو تجاوز کر کے ذہنی وفکری دیوالیہ پن کا ثبوت دینے لگے، لیکن مولانا حق پر جمے رہے اور بالاخر اللہ کی توفیق سے ہندوستان کا اکثر طبقہ اخوان کی تایید اور سعودیہ کی مخالفت کرتا نظر آیا، جو لوگ کسی ''اگر'' ''مگر'' کا سہارا لے رہے تھے وہ بھی اب سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کیوں نہ ترجمان حق ندوۃ العلماء کا موقف اختیار کیا جائے،..... **بقیہ اگلے صفحہ پر**>>

>>**گذشتہ صفحہ کا بقیہ نوٹ ''ندوۃ العلماء......''**

......اس پورے منظر نامے میں مولانا کے رسالہ''بانگ حرا'' نے بڑا کردار ادا کیا ہے، راقم سطور کے رسالہ''ندائے اعتدال'' نے بھی یہ فرض ادا کرنے کی حقیر کوشش کی اور کسی درجہ میں صحیح مگر خود اپنے قلم کا بھی واجبی حق ادا کیا، فاضل مضمون نگار نے اس ضمن میں اپنے قلم کو تقریبا وقف کر دیا اور دن رات اپنے حصہ کا حق ادا کرتے رہے، لیکن اس مضمون پر ذرا سا اضافہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس مرتبہ دیوبند کے بڑے عالم کے ایک نا عاقبت اندیش بیان کے باوجود قاسمی علماء وفضلاء بالخصوص نوجوان اہل قلم کے متعدد مضامین شائع ہوئے، لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا موقف ہندوستان کے مسلمانوں کے متحدہ موقف کے طور پر سامنے ہے، ندوہ حق کے ساتھ کھڑا ہے، باطل اور اس کے ہمنواؤں کو انشاء اللہ جلد ہی سبق ملے گا یا پھر وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کی کوشش کریں گے سیھزم الجمع ویولون الدبر ۔ (مدیر)

بقیہ صفحہ نمبر ۶۲ کا 'اردو غان حکومت ......'

......میں حکومت کے اس بل کی سختی سے مخالفت کی ہے، جس میں فتح اللہ گولن کی جماعت کے تحت چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کو بند کر دینے کی بات کہی گئی ہے، استنبول سے پبلک ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار ساری گل نے ان تعلیمی اداروں کی اہمیت اور دینی شعائر کے تحفظ میں ان کے کردار پر دیر تک بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے، واہ کیا خوب ہے!۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں بازی گر دھوکہ کھلا

جہاں تک بات ہے بلدیاتی انتخاب میں 'ساری گل' کی کامیابی کی، تو تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ عوامی ریپبلکن پارٹی اور فتح اللہ گولن کی جماعت کے درمیان اس معاہدہ کی وجہ سے انصاف اور ترقی پارٹی پیچھے ہو سکتی ہے، موجودہ میئر قادر توپاش جو استنبول کی انتہائی مقبول شخصیت ہیں، سرکاری اور غیر سرکاری سروے کے مطابق ان کی عوامی مقبولیت ساری گل سے بہت بڑھی ہوئی ہے، پسپا ہو سکتے ہیں، یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ آنے والے انتخاب میں بھی قادر توپاش کو ہی امیدوار بنائے جانے سے پارٹی کے اندر کچھ بے چینی سی محسوس کی جا رہی تھی، کیوں کہ اندازہ تھا کہ پارٹی کسی نوجوان کو موقع دے گی، لیکن اس فیصلہ سے اس وقت بڑا اطمینان ہوا اور سبھی نے فیصلہ کو درست قرار دیا جب گولن کی جماعت اور عوامی ریپبلکن پارٹی کے درمیان معاہدہ کا راز فاش ہو گیا۔

نئی انتخابی گروپنگ

دن بدن یہ بات بھی کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ 'انصاف اور ترقی پارٹی' بھی پچھلے کئی سالوں سے اس مقابلہ کی تیاری میں لگی ہوئی ہے اور گزشتہ دو سالوں میں اس نے اپنے لئے اپنے نئے انتخابی دھڑے تلاش کر لئے ہیں جو فتح اللہ گولن اور اردوغان کے درمیان کشمکش کی وجہ سے کٹنے والے ووٹوں کا متبادل بن سکیں، انصاف اور ترقی پارٹی کے اعداد وشمار کے مطابق کٹنے والے ووٹوں کی تعداد تین فیصدی اور فتح اللہ گولن کی جماعت کے سروے کے مطابق یہ تعداد ۷ رفیصد تک پہنچتی ہے۔

سال گذشتہ وزیر اعظم اردوغان نے بڑی قوت اور جوش کے ساتھ داخلی استحکام کے لئے امن معاہدہ کیا اور اس کے ذریعہ انہوں نے کردوں کے ساتھ تقریبا ربع صدی سے چل رہی مسلح کشمکش کا خاتمہ کیا اور کردستانی لیبر پارٹی کو ڈیموکریٹک اصلاحات کے جتھے میں شامل کیا، جس کی وجہ سے کردوں میں اردغان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے، کردوں کی تعداد تقریبا ۱۸ رملین افراد تک پہنچتی ہے، ان کی کثیر آبادی جنوب مشرقی صوبوں میں ہے اور ایک بڑی تعداد استنبول میں بھی آباد ہے، اردوغان نے ترکی کے اندر اپنے حالیہ اصلاحات کے ذریعہ کردوں کے علاوہ ترکی میں آباد دیگر نسلی اقلیتوں کا دل بھی جیتا ہے، جن میں ارمن، گوجر، اشوری، عرب اور آذربیجانی نسلیں قابل ذکر ہیں، یہ وہ اقلیتیں ہیں جو ترکی کے ریڈیکل قوم پرست حکمرانوں کے مظالم کے نشانہ پر رہی ہیں اور جن کے تشخص، ثقافت اور زبان کو مٹانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، وزیر اعظم اردوغان کی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے تمام ترک شہریوں کا خیال رکھا اور گوجر نسل کے ترکوں کی تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لئے ایک مخصوص ادارہ کا بھی افتتاح کیا، اسی طرح یہ پہلی حکومت ہے جس نے حکومتی اداروں اور سڑکوں کے نام رکھنے میں غیر ترکی ناموں کے استعمال اور ان سے موسوم کئے جانے کی سرکاری سطح پر اجازت دی اور انتخابی مہم میں مقامی زبان کے استعمال سے بھی پابندی اٹھالی، خیر آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ (بشکریہ ماہنامہ بانگ حراء)

☆☆☆

عالم اسلام

اردگان حکومت اور فتح اللہ گولن کے درمیان کشمکش- ایک جائزہ

تلخیص وترجمانی: مسعود عالم ندوی، استاذ مدرسہ سیدنا بلالؓ لکھنؤ

نوٹ: راقم ترکی کی اسلامی حکومت کے متعلق کسی شمارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہے، حال میں ترکی کے حالات میں ایک نیا موڑ آیا، ایک وہ شخص جس کو جدید ترکی کا معمار و مصلح سمجھا جاتا تھا وہ ایک منحرف فکر اور بعض اسلام دشمن نظریات کے ساتھ منظر عام پر آیا، دنیا اسے فتح اللہ گولن کے نام سے جانتی تھی، لیکن اب اس شخص کو امریکی تربیت یافتہ فتح اللہ گولن سمجھنا چاہیے، تحقیقات یہ ہیں کہ ان کی پوری فنڈنگ امریکہ کرتا ہے اور ترکی میں احیائے اسلام کے لئے ترقی کی راہ پر بڑھتے ہوئے اردغان کے قدم کو روکنے کے لئے وہ گولن صاحب کو استعمال کر رہا ہے، مغرب کو یہ کب گوارہ کہ جس ترکی کو وہ قتل کر چکا تھا وہ قیادت کیا! ہم پلہ بن کر بھی ابھرے! گولن صاحب کے کارہائے نمایاں ان کی سازشی ذہنیت اور دوہرے کردار اور حالیہ اسلام دشمنی اور ناعاقبت اندیش اقدامات پر یقین کرنے سے مانع ہیں، لیکن تحقیقات اب قطعیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اس لئے حسن ظن کی گنجائش نہیں، یہ مضمون ان ہی تحقیقات کا ایک ادنی جزء ہے جس سے اس کشمکش کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اور پھر صحیح بات یہ ہے کہ اس دور میں یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ کون واقعی اسلام کا خادم ہے اور کون امریکی ایجنٹ CIA کس کس طرح اپنے پیسہ سے لوگوں کو خریدتی ہے اور پیٹ بھرتی ہے اس کا اندازہ بڑے بڑے دانشوروں کو بھی نہیں! اس کام کے لئے اس کا بہت بڑا بجٹ مختص ہے، سب جانتے ہیں کہ ہاتھی کے جو دانت نظر آتے ہیں وہ کھانے کے نہیں ہوتے، فتح اللہ گولن صاحب کا اب تک کا کام ہاتھی کے ان ہی دانتوں کی طرح نمائش کے لئے تھا جب ان کو دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ گئی تو پھر موجودہ چہرہ منظر عام پر آیا، جو ان کے وہ دانت ہیں جن کو سرجری کے ذریعہ امریکہ نے ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کو کھانے کے لئے لگایا ہے۔

سردست ترکی کے حالیہ بلدیاتی انتخابات نے اردوغان کے ترقیاتی اقدامات اور امن معاہدوں کی بدولت تمام سازشوں کو شکست دے کر نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، لیکن باطل اپنے تمام لاؤلشکر کے ساتھ میدان میں ہے، آئندہ مہینوں میں ترکی میں صدارتی انتخابات ہونے والے ہیں، مرد آہن اردوغان کی کوششوں کے ساتھ ہماری دعائیں ضروری ہیں۔ (مدیر)

ترکی یورپ اور ایشیاء کے درمیان پل کی حیثیت رکھنے والا ایک عظیم ملک ہے، جہاں پچھلے گیارہ برسوں سے اسلام پسند انصاف اور ترقی پارٹی کی حکومت قائم ہے، وزیر اعظم رجب طیب اردوغان اور صدر عبداللہ گل کی قیادت میں اس نے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنا شروع کیا اور وہ مسلسل اس راستے پر گامزن ہے، اس وقت پوری مشرقی اور مغربی دنیا ترکی کو ترقی کے رول ماڈل کے طور پر دیکھ رہی ہے، ساتھ ہی داخلی اور خارجی سطح پر اس حکومت کو اکھاڑ پھینکنے اور وزیر اعظم رجب طیب اردوغان اور تمام اسلام پسند وزراء و افسران کے ساتھ ڈاکٹر محمد مرسی اور ان کے ہمنواؤں جیسے سلوک کئے جانے کے لئے مستقل ریشہ دوانیاں بھی کی جارہی ہیں، پچھلے چار مہینوں کے اندر انصاف اور ترقی پارٹی اور امریکہ میں مقیم معروف ترکی

اسکالر فتح اللہ گولن اور ان سے وابستہ افراد اور اداروں کے درمیان کشمکش کی خبریں موصول ہوئی ہیں، کوتش گروپ اور عوامی ریپبلکن پارٹی کی حکومت مخالف سرگرمیاں سامنے آئی ہیں، امریکہ میں مقیم حکومت مخالف رجحان رکھنے والے ترک شہریوں اور ساز باز کرنے والوں کے سلسلہ میں بھی انکشافات ہوئے ہیں، ذیل میں اس کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

ترکی کے اندر حالیہ دنوں میں جو کچھ ہوا اور ہورہا ہے اور جسے اردوغان حکومت اور گولن کے درمیان کشمکش اور محاذ آرائی کا نام دیا جارہا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا؟ نتیجہ کس کے حق میں رہے گا؟ کس کا پلڑا بھاری ہوگا؟ اس سلسلہ میں کچھ غیر متوقع نہیں ہے، اردوغان کا وہ خطاب جس میں انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ کہا ہے ''ہماری آزادی اور خودمختاری پر جو قدغن لگانے کی کوشش کرے گا، ہم اس کا پنجہ توڑ دیں گے''، یہ سوال بھی بار بار پیدا ہورہا ہے کہ آخر ایک اسلامی جماعت اور اسلامی تحریک کیوں اسلام پسند حکومت سے متصادم ہورہی ہے، اس سلسلہ میں تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اس اسلامی جماعت نے حکومت سے کشمکش کا رویہ اختیار کیا ہے بلکہ اس نے ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا لیے ہیں جنہوں نے حکومت کے خلاف اقدامات کا پختہ ارادہ کر لیا ہے، اور انہیں لوگوں نے اس تحریک کو بالکل فرنٹ میں کر دیا ہے، کیوں کہ داخلی اور خارجی سطح پر کچھ ایسے عناصر ہیں جو ترکی کی موجودہ ترقی اور اس کے قائدانہ اور جرأتمندانہ کردار سے خائف ہیں اور کسی بھی حال میں اسے موجود راستہ پر گامزن رہنے دینا نہیں چاہتے ہیں، خود وزیر اعظم رجب طیب اردوغان نے بھی اپنے حالیہ خطاب میں اس کا اشارہ دیا ہے۔

اس اسلامی جماعت کا یہ کردار کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ اس نے ہمیشہ ہی نام نہاد انقلابیوں کا ساتھ دیا ہے، اسی درمیان جب کہ فتح اللہ گولن آج اپنے حامیوں سے پرزور اپیل کررہے ہیں کہ وہ جماعت کے تعلیمی مراکز پر تالا لگانے سے روکنے کے لئے پوری طاقت جھونک دیں، اس سے پہلے وہ انقلابیوں کے سامنے یہ پیشکش رکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے تمام تعلیمی مراکز ملک کے حوالہ کر دیں گے، لیکن آج انہوں نے اپنا ہاتھ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ڈال دیا ہے جنہوں نے مسلم خواتین کو حجاب سے روکا اور اسلام سے جنگ کی، یہ جماعت جس طرح ماضی میں انقلابیوں کی مدد کر چکی ہے، آج بھی وہ انقلابیوں کا ساتھ دے سکتی ہے، اور ایک ایسی جنگ کی قیادت کے لئے آگے آسکتی ہے جس سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔

کوتش گروپ:

'انصاف اور ترقی پارٹی' کی حکومت اور ترک، ذرائع ابلاغ، سیاست اور مالیات کی دنیا میں تین لوگوں کا سکہ چلتا تھا، ان میں پہلا شخص جیم اوزان ہے جو اس وقت فرانس میں مقیم ہے، اور مختلف جرائم میں ۲۳ سال قید کی غائبانہ سزا کاٹ رہا ہے، دوسرا شخص آیدین دوغان ہے جو ترکی ذرائع ابلاغ میں شہنشاہ کی حیثیت رکھتا تھا، متعدد سنگین جرائم کی پاداش اور حکومت کے خلاف انقلاب اور بغاوت کی دعوت کی وجہ سے عتاب جھیلتے جھیلتے اس وقت بہت کمزور ہوگیا ہے، اور اس نے اپنے بہت سے اداروں کو فروخت بھی کر دیا ہے، اب رہ گئی بات تیسرے نام کی تو وہ کوتش فیملی، اور اس کے سربراہ مصطفیٰ کوتش ہیں، جنہوں نے اردوغان حکومت کے خلاف اس وقت کھلی محاذ آرائی شروع کی، جب حکومت کے قریبی ذرائع نے ان پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ کوتش گروپ کی یونیورسٹی سے حکومت مخالف رجحان کو بڑھاوا دے رہے ہیں، مخالفین کو مال اور فکری توانائی فراہم کر رہے ہیں، گزشتہ برس پیش آنے

والے ''جیزی پارک'' واقعہ کو ہوا دینے میں اس کا بڑا حصہ ہے، حکومت کے قریبی ذرائع نے یہ بھی کہا ہے کہ اس یونیورسٹی کے سربراہ نے تمام طلبہ کے نام ایک خط روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ امتحانات سے غیر حاضر رہنے والے طلبہ کو دوبارہ امتحان دینے کا موقع دیا جائے گا، اس خط پر وزیر اعظم اردوغان نے ازخود ریمارک بھی دیا تھا۔

تین مہینے قبل مصطفیٰ کوتش نے ایک خصوصی میٹنگ بلائی تھی، جس کے نامور شرکاء میں فوجی عہد میں سات مرتبہ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہ چکے سابق صدر سلیمان دیمرال، کوتش گروپ کے سابق چیرمین مصطفیٰ کوتش کے والد 'رحمی کوتش' اور 'آیدین دوغان' کے معاون خصوصی تایلاں، بیلغان شریک تھے، اس نشست پر نگاہ رکھنے والے تمام مبصرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آنے والے مرحلہ کے لئے مرکزی شخصیت کی حیثیت سے 'ساری گل' کا انتخاب ہوا، جو عوامی ریپبلکن پارٹی کی طرف سے پہلے تو استنبول کے میئر ہوں گے پھر ترکی کے وزیر اعظم۔

پبلک ڈیموکریٹک پارٹی

ترکی میں قصر حکومت کا راستہ استنبول کے میئر کی گلی سے ہوکر گذرتا ہے، یعنی ترکی میں وزیر اعظم بننے سے قبل استنبول کا میئر بننا پڑتا ہے، اسی معروف سیاسی مقولہ کے تناظر میں حسب توقع 'ریپبلک ڈیموکریٹیک پارٹی' نے اعلان کیا ہے کہ ۳۰ مارچ ۲۰۱۴ میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں 'مصطفیٰ ساری گل' استنبول سے پارٹی کے میئر عہدہ کے امیدوار ہوں گے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عوامی ریپبلکن پارٹی اسلام جماعت اور تحریکوں کو ترکی کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتی رہی ہے، لیکن حال ہی میں اس کے ایک نمائندہ وفد نے امریکہ کا خصوصی دورہ کیا، جہاں ان کی ملاقات فتح اللہ گولن تحریک کی مقتدر شخصیات سے ہوئی، اس کے بعد سے یہ پارٹی اس جماعت کے لئے محبت کا اظہار کر رہی ہے اور پارٹی کی دوسری سب سے بڑی ابھرتی ہوئی شخصیت 'ساری گل' اس اسلامی جماعت کے اقدامات کی حمایت کر رہے ہیں، اس کے ماتحت تعلیمی اور ثقافتی اداروں کو مذہب اور اخلاق و اقدار کی حفاظت کے لئے اہم اور ضروری قرار دے رہے ہیں۔

آئندہ ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں پارٹی امیدوار منتخب ہونے سے چند گھنٹے قبل، میڈیا سے وابستہ ترکی کی معروف شخصیت 'سیفلای پوکسالیر' نے کہا کہ ''مصطفیٰ ساری گل نے بذات خود مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے فتح اللہ گولن کی جماعت کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اس لئے جماعت ان کی مدد کر رہی ہے اور ہونے والے انتخابات میں آئندہ بھی مدد کرتی رہے گی، مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو انہیں نکل کر تردید کرنی چاہیے، وہ حقیقت کے اظہار سے کیوں شرما رہے ہیں؟ انہوں نے زور دے کر یہ بھی کہا کہ ''ساری گل'' ایک منصوبہ بنا رہے ہیں اور اس منصوبہ کے پس پردہ کوتش گروپ، فتح اللہ گولن کی جماعت اور مختلف امریکی لابیاں کام کر رہی ہیں۔''

امریکی مفادات کے نئے محافظ

عوامی ریپبلکن پارٹی کے نومنتخب صدر 'کمال کیلیتشا اوغلو' نے پارٹی کے منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد امریکہ کے اولین دورہ میں واشنگٹن کے اندر پارٹی دفتر کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ ''مستقبل قریب میں ہی ہم امریکہ کے لئے بہت کچھ لائیں گے'' کمال کیلیتشا اوغلو کے اسی بیان کی وجہ سے متعدد عالمی سطح کے تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امریکہ اردوغان حکومت کے خاتمہ کی پلاننگ کر رہا ہے، پوری

مغربی دنیا اور بطور خاص امریکہ، ترکی کے موجودہ کردار اور خطہ میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف ہے، انہیں ڈر ہے کہ کہیں استنبول بھی اپنے سیاسی وزن اور معاشی ترقی کی وجہ سے لندن اور نیویارک جیسے شہروں کے مقابلہ میں نہ آجائے، اور اپنے جائے وقوع اور بے مثال تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ کی وجہ سے ان سے کہیں سبقت نہ لے جائے۔

امریکی مفادات کے نئے محافظ ہی رواں صدی میں امریکی منصوبہ بندی کے پرچم بردار ہیں، ان میں ایک طبقہ تو مذہب بیزار، اور لبرل ہے اور دوسرا طبقہ متحفظ اور مذہبی رجحان رکھنے والا ہے، لیکن امریکی خاکہ میں رنگ بھرنے کے لئے یہ طبقہ بھی لبرل ازم کی روح کے ساتھ ہی کام کرتا ہے، اس لبرل اور ریزرو طبقہ کے باہمی تعاون، عملی اشتراک اور کنٹرول کا ہر جگہ اچھی طرح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، عالمی ذرائع ابلاغ پر بھی، ہائی پروفائل معاشی اداروں اور لابیوں میں بھی اور امریکہ کے اندر باہر اہم ترین سیاسی اور انتظامی فیصلوں پر بھی، متعدد چوٹی کے تجزیہ نگار جن میں ترکی کی نامور صحافی 'سیفلای یوکسالیز' بھی ہیں، لکھتے ہیں کہ عوامی ریپبلکن پارٹی اور فتح اللہ گولن کی جماعت کے ساتھ امریکی مفادات کے ان نئے محافظوں کے معاہدہ کا بنیادی طور پر ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے وزیر اعظم اردوغان اور ترکی خبر رساں ایجنسی کے سربراہ 'ہاکان فیدان' کو کسی بھی طرح اقتدار سے بے دخل کرنا، کیوں کہ ان دونوں ترک رہنماؤں نے موجودہ عالمی طاقتوں کے ساتھ بہت ہی مضبوط اور غیر جانبدارانہ موقف کا اظہار کیا ہے، اردوغان کے ان مواقف کا اظہار خطے کے مسائل میں ان کی بیباکانہ رائے اقدامات سے ہوا ہے، تو وہیں ہاکان فیدان نے ترک خبر رساں ایجنسی کو اسرائیلی خبر رساں ایجنسی موساد کے چنگل سے آزاد کرایا ہے۔

حالیہ برسوں میں امریکی ذرائع ابلاغ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس کے ایجنٹوں نے انتہائی منظّم طریقہ سے بڑی قوت اور شدومد کے ساتھ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے بہت سے حربے اپنائے ہیں، جمہوری نظام کے مطابق اکثریت سے منتخب وزیر اعظم کو ''سلطان'' اور خلافت اسلامیہ کی تجدید کا خواب دیکھنے والا قرار دینا، سال گزشتہ تقسیم والے واقعہ کو زبردست میڈیا کوریج دینا اور برابر حکومت مخالف ٹیبل اسٹوری کو نیوز کے طور پر شائع کرنا اور معمولی خبروں کو غیر معمولی اہمیت کے ساتھ نشر کرنا سب انہیں عزائم کا حصہ ہیں۔

مالی بد عنوانی کے پس پردہ

حالیہ مالی بدعنوانی کی آڑ میں جہاں عوامی ریپبلکن پارٹی نے اور فتح اللہ گولن کی جماعت نے معنوی اور نظریاتی فائدہ اٹھایا، وہیں امریکہ بہادر نے معروف ایرانی نژاد ترکی تاجر رضا زراب کی تذلیل اور سرزنش کا اپنا اہم ترین مقصد بھی حاصل کرلیا، رضا زراب ترکی اور ایرانی حکومت کے درمیان تجارتی رابطہ کی اہم کڑی کی حیثیت رکھتے تھے، چونکہ ایران پر معاشی پابندیاں عائد ہیں اور ترکی حکومت کو بھی گزشتہ کئی سالوں سے ایران سے درآمد شدہ پٹرول کی قیمت ترکی میں قائم ایرانی بینک اکاونٹوں میں ہی جمع کرنی پڑتی تھی تاکہ ایران بعد میں اس کے بدلہ رضا زراب اور دیگر قریبی تاجروں کے ذریعہ سے ترکی سے سونا خرید سکے، رضا زراب نے رہائی کے بعد فوراً میڈیا سے بات چیت کے دوران اپنے اوپر لگے ہوئے تمام الزامات کو مسترد کردیا اور کہا کہ ''میں قانونی طور پر روزانہ ایک ٹن سونا درآمد اور برآمد کرتا ہوں، اور ترکی میں سونے کی تجارت پر کوئی ٹیکس ہی نہیں ہے تو پھر میں کیوں کسی کو رشوت دوں؟'' انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ ایک مرتبہ زرفروش کے کاغذات میں کچھ خامیوں کے رہ

جانے کی وجہ سے افریقہ سے آنے والا سونا رک گیا، اور جب میں نے مسئلہ کے حل کے لئے کوشش شروع کی، تو سیکورٹی کے ایک اعلی افسر نے مجھے ڈرایا، پھر مجھ سے ڈیڑھ ملین ڈالر کی رقم (رشوت) کا مطالبہ کیا، میں نے اس معاملہ کی شکایت وزارت داخلہ میں درج کرادی ہے، اور ثبوت کے طور پر ویڈیو ریکارڈنگ بھی پیش کردی ہے، میڈیا سے گفتگو کے دوران مسٹر زراب نے یہ بھی کہا کہ ''کچھ عرصہ کے بعد ایک صحافی نے مجھ سے ٹیلفونک رابطہ کیا اور کہا کہ آپ پر کرپشن (مالی بدعنوان) کے الزامات ہیں، میں نے انہیں اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک وکیل کے حوالہ کردیا، پھر اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے ہراساں کرنا چاہ رہا ہے اور ان فائلوں کو کلوز کرنے کے عوض میں ایک ملین ڈالر رشوت مانگ رہا ہے، یہ ساری گفتگو میرے پاس ریکارڈ ہے، میں نے انکوائری کرنے والے فاضل جج کو بھی بتلادیا ہے، کہ پوری گفتگو کی ریکارڈنگ بھی میں پیش کرسکتا ہوں'' بعد میں رضا زراب نے یہ ساری تفصیلات یوٹیوب پر بھی ڈال دیں،'' زراب کہتے ہیں کہ میں نے کئی ماہ پہلے ہی اس کی جانکاری وزارت داخلہ کو دے دی ہے، مذکورہ سیکورٹی آفیسر اور صحافی کے خلاف دعوی بھی دائر کردیا ہے، مگر عجیب وغریب بات ہے کہ یہ لوگ مجھ ہی پر مقدمہ چلا رہے ہیں یعنی ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' والی بات ہورہی ہے۔

ترکی اور ایران کے مابین اقتصادی تعلقات میں ہالک بینک کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، امریکہ یا بالفاظ دیگر امریکی عزائم کے ان نئے محافظوں نے اس بینک کے چیئرمین پر مالی بدعنوانی کا الزام لگا کر اور پھر اس بینک پر پابندی عائد کرکے، اپنا ایک معاشی مفاد بھی حاصل کرلیا، ایرانیوں کے ساتھ لین دین سے بینک کو روک کر امریکہ پابندیوں کو مزید سخت کردے گا۔

آئندہ انتخاب میں اردوغان کو شکست دینے، ان کی حکومت کو اقتدار سے برطرف کرنے کیلئے ہی، فتح اللہ گولن کی جماعت نے عوامی ریپبلکن پارٹی سے معاہدہ کیا ہے، اور ان حالات کا سامنا کرنے سے پہلے ہی اردوغان نے بھی متبادل تیار کرلیا ہے۔

پانچویں دہائی میں عدنان مندریس کی پھانسی کے بعد سے پچھلے سالوں تک ترکی میں اسلامی تحریکات، اداروں اور ترکی حکومت کے درمیان برابر کشمکش رہی ہے، مگر فتح اللہ گولن کی جماعت نے ہمیشہ حکومت کی تائید کی تھی اور انہوں نے اسلامی اقدار و اصول سے شدید نفرت رکھنے والے 'حجاب کے کٹر مخالف' کمیونزم نظریات کے حامل، سابق ترکی وزیر اعظم بولنٹ اجاوید کی تائید وحمایت شروع کردی، حکومت وقت کی تائید وحمایت کے اپنے تمام ریکاڈ کے بالکل برخلاف فتح اللہ گولن کی تنظیم ''الـحـدقة'' پچھلے کئی سالوں سے برسر اقتدار ''انصاف اور ترقی پارٹی'' کی مخالفت پر آمادہ ہے، بلکہ اس میں اپنی پوری توانائی صرف کررہی ہے، اس جماعت کو حکومت میں شامل ایک بڑی طاقتور اور مؤثر شخصیت ہاکان فیدان سے کچھ زیادہ ہی ''بغض'' ہے، کیوں کہ ہاکان فیدان نے ترک خبر رساں ایجنسی میں فتح اللہ گولن کی جماعت کی بیجا دخل اندازی پر روک لگادی تھی اور وزیر اعظم کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر اسرائیل کے لئے ڈیلومیٹک مصیبت پیدا کردی تھی، جس سے ان نام نہاد ''اسلامی جماعت'' کی معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوئے، ادھر اگر چہ بعض تجزیہ نگار لکھ رہے ہیں کہ تعلقات کی کشیدگی کچھ کم ہورہی ہے اور وزیر اعظم کی طرف سے فتح اللہ گولن کے تمام اداروں کو بند کئے جانے کی بات درحقیقت انہیں جاری رکھنے کی کھلی ہوئی اجازت کے سوا کچھ نہیں ہے،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ فتح اللہ گولن اور ان کی جماعت نے اردوغان، ان کی حکومت اور ''انصاف اور ترقی پارٹی'' کے خلاف مہم چھیڑدی ہے، اس کی پوری کوشش ہے کہ وہ اسلام پسند روایتی حریف عوامی ریپبلکن پارٹی کو آئندہ انتخابات میں ہر ممکن طریقہ سے تقویت پہونچائے اور رجب طیب اردوغان کی حکومت کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرے۔

مالی بدعنوانی کا مسئلہ

کل منگل کی صبح تک کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مالی بدعنوانی مخالف دستہ، انصاف اور ترقی پارٹی سے وابستہ دسیوں افراد کو گرفتار کرلے گا، گرفتار کئے جانے والوں میں وزیر داخلہ کے بیٹے کے علاوہ دو اور سینئر وزراء کے فرزند، اور الفاتح میونسپل کارپوریشن کے چیئر مین، جو برسر اقتدار پارٹی کے تاسیسی ارکان میں سے ہیں بھی شامل ہیں اور گرفتاریاں رشوت کے طور پر بھاری رقم وصولی کرنے اور مالی بدعنوانی کے الزامات کی تحقیق کے لئے عمل میں آئی ہیں، اس معاملہ میں تحقیقاتی آفیسر کے دفتر سے جاری سرکاری بیان کے مطابق تحقیقات کا عمل پچھلے ایک سال سے جاری تھا، ملزموں کے روابط اور سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جارہی تھی، تاہم اس نازک وقت میں آخر یہ معاملہ کیوں سامنے لایا گیا؟ اس کے پیچھے کون سے جذبات کام کر رہے ہیں؟ اسی طرح پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس تحقیقاتی آفیسر کا فتح اللہ گولن کی جماعت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس گھڑی میں اس معاملہ کے سامنے آجانے سے جہاں حکومت پر آنچ آتی ہے، وہیں وزیر اعظم اردوغان اور ان کی پارٹی دونوں کے لئے انتہائی تکلیف کی بات ہے، یہ الگ بات ہے کہ ماخوذ لوگوں میں سے اب تک عدالت نے کسی کی بھی سرزنش نہیں کی ہے، البتہ ایک وزیر کے بیٹے پر کچھ آنچ آسکتی ہے، اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ موجودہ ترک حکومت کے لئے پریشانی کا باعث ہوگی، کیوں کہ اس کی وجہ سے وزیر اعظم اردوغان کو وزارتی کونسل میں بڑی تبدیلی لانی ہوگی، ساتھ ہی اگر ترکی عدلیہ کی تاریخ اور طریقہ کار کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تحقیقات کا عمل ابھی جاری رہے گا اور کیس فائنل ہونے میں کئی سال لگ جائیں گے اور مخالف پارٹیاں آئندہ ہونے والے بلدیاتی، صدارتی اور مجلس قانون ساز کے انتخابات میں انصاف اور ترقی پارٹی کے خلاف ماحول سازی میں اس کا خوب پروپیگنڈہ کریں گی۔

ان گرفتاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیر اعظم اردوغان نے کہا کہ ''عدالت کے فیصلہ سے پہلے میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، انہوں نے عمومی طور پر صرف اتنا کہا کہ ''وہ لوگ جو تاریکی، تعصب اور دھڑابندی کا سہارا لے کر کام کرنا چاہتے ہیں اور مال و دولت، ذرائع ابلاغ کے بھروسہ ہی خاکے بناتے رہتے ہیں، وہ ترکی کے لئے کوئی راہ عمل تجویز نہیں کر سکتے، ہم ہرگز کسی بھی دھمکی کے سامنے جھکنے والے نہیں ہیں، انہیں جو گھناؤنا کھیل کھیلنا ہے کھیل لیں، اور جو جو معاہدہ جن سے کرنا ہے، کرلیں،'' وزیر اعظم نے اپنی گفتگو کا اختتام اس طرح کیا کہ ''اگر کچھ لوگوں کے پاس توپ، ٹینک، بندوق، چھرے اور گولے ہیں، تو ہمارے پاس بھی ہمارا رب اللہ ہے، جو ہمارے لئے کافی ہے'' (اب آج بتاریخ ۴ مارچ ۲۰۱۴ء خبر آئی ہے کہ سارے الزامات بے بنیاد تھے، اور گرفتار شدگان بری کردیئے گئے ہیں۔)

ترک پارلیمانی ممبران کے استعفے

پارلیامنٹ میں فتح اللہ گولن کی جماعت کی سیاسی نمائندگی ہمیشہ بہت ہی محدود رہی ہے، چونکہ جماعت کا عمومی رجحان ملک

کے اندر فیصلہ کن کلیدی عہدوں تک رسائی حاصل کرنا رہا ہے، جبکہ سیاسی مناصب سے وہ ہمیشہ دور رہی ہیں، چنانچہ انصاف اور ترقی پارٹی کے پارلیمانی گروپ کے مقابلہ میں ان کی تعداد صرف ۲۰ رتک پہنچتی ہے اور اتنی بھاری اکثریت والی پارٹی کے سامنے جماعت کے یہ ممبران جماعت کے ساتھ اپنے گہری وابستگی کی بھی ضمانت نہیں دے سکتے، ان سب کے باوجود استعفے کی کاپی کو انتہائی پرخطر اور برسر اقتدار پارٹی کے لئے سب سے بڑا دردسر سمجھا جارہا ہے، اور کہا جارہا ہے کہ اس موقع پر فتح اللہ گولن کی جماعت اپنے مفادات کی خاطر زبردست گیم کھیلے گی، کیوں کہ اسے یقین ہے کہ دنیا بھر میں موجود اپنے ہمنوا ذرائع ابلاغ وترسیل کے سہارے ہر ہر استعفیٰ کے بعد حکمراں پارٹی کے خلاف وہ زبردست مہم چلانے میں کامیاب ہوجائیں گے، آخری دنوں میں کام کرنے کا وہ اسلوب اور طریقہ کار جسے جماعت اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر اختیار کرے گی، اس وقت سامنے آگیا جب استعفے کی کاپی سامنے آئی، پارلیامنٹ میں انصاف اور ترقی پارٹی کے ۳۲۵ ممبران میں سے صرف دو ممبران کے استعفیٰ دینے پر فتح اللہ گولن تحریک اور ان کے ہم نوا ذرائع ابلاغ نے دنیا بھر میں ایک طوفان برپا کر دیا، مذکورہ جماعت کے قریبی اور معتمد صحافیوں اور دیگر ذرائع ابلاغ نے یہ تک کہنا شروع کر دیا کہ اگر فتح اللہ گولن اور برسر اقتدار حکومت کے درمیان یہ کشمکش جاری رہی تو دس عہدیداروں کو اپنے عہدوں سے استعفے دینے پڑیں گے۔

عوامی ریپبلکن پارٹی اور فتح اللہ گولن کی جماعت کے درمیان معاہدہ کی عجلت کا راز

ابتداء میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ عوامی ریپبلکن پارٹی اردوغان اور گولن کے درمیان جاری کشمکش کا دور سے ہی مشاہدہ کرے گی، خود اس میں کوئی دلچسپی نہیں لے گی، کیوں کہ دونوں ہی سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے اس کے سب سے بڑے حریف تصور کئے جارہے ہیں، لیکن عوامی ریپبلکن پارٹی کے صدر 'کیلیتشار اوغلو' کے حالیہ امریکی دورہ اور وہاں مقیم گولن کی جماعت کے اہم ارکان سے ملاقات کے بعد تو پورا منظر نامہ ہی بدل گیا، اور اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا کہ امریکہ اس بات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے، کہ کسی بھی طرح وزیر اعظم رجب طیب اردوغان کو اقتدار سے بے دخل کیا جائے، اور ترکی کی سیاست میں یہ جملہ تو محاورہ کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ ترکی کی وزارت عظمی کا راستہ استنبول کے میئر سے ہوکر گزرتا ہے اور یہاں سے اس مرتبہ 'ساری گل' کو امیدوار بنایا ہے، یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ گولن کی جماعت اور عوامی ریپبلکن پارٹی کے درمیان اس بات پر پختہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ اردوغان کے امیدوار کو ہرا کر کسی بھی طرح استنبول کے میئر کے عہدہ تک ساری گل کو پہنچانا ہے اور اس طرح ایک (نام نہاد) اسلامی جماعت اور ایک لادینی جماعت کے درمیان امریکہ بہادر کی نگرانی میں معاہدہ ہوگیا ہے، تاکہ اردوغان حکومت کو ترکی کے اقتدار سے برطرف کیا جاسکے۔

تعجب خیز اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بالکل ہی دو متضاد نظریات کی حامل دو جماعتیں کیسے اتنی جلدی ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوگئیں؟ آخر اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ اس باہمی قربت کے نتیجہ میں ایک لادینی پارٹی جو اسلام پسندوں اور تمام اسلامی مظاہر اور نقوش سے اپنی شدید دشمنی اور بغض وعناد کے لئے معروف ہے، نے اپنے ایک عوامی اجلاس

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۴ پر)

لمحۂ فکریہ

اگر اخوان دہشت گرد ہیں...

شاہ اجمل فاروق ندوی

دہشت گرد یا دہشت گردی (Or Terrorism Terrorist) کی اصطلاح 9/11 کے بعد رائج ہوئی۔ جب یہودیوں نے امریکا کے عالمی تجارتی مرکز (World Trade Centre) اور پنٹاگن پر حملہ کرکے امریکا کے ذریعے افغانستان میں شرعی بنیادوں پر قائم ہونے والی حکومت کو ختم کرنے کی سازش رچی۔ دنیا بھر میں دہشت گردی کا ہوّا کھڑا کرکے خوب تباہی مچائی گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں بم دھماکے کروا کر پوری دنیا کو یہ سمجھایا گیا کہ دہشت گردی ایک عالمی مصیبت ہے، جس کا مقابلہ ہم سب کو مل کر کرنا چاہیے۔ سابق امریکی صدر جارج واکر بش نے یہ دھمکی بھرا اعلان بھی کیا کہ ''اس دہشت گردی مخالف جنگ میں جو ہمارے ساتھ نہیں، وہ دہشت گردوں کے ساتھ ہے''۔ تیسرا کوئی اختیار (Option) نہیں ہے۔'' مسلم دنیا بالخصوص سعودی عرب اور پاکستان نے جب دہشت گردی مخالف عالمی مہم میں کوئی خاص دل چسپی نہیں دکھائی تو ان دونوں ممالک میں بھی بم دھماکے کرائے گئے اور انہیں بھی عملی طور پر اپنا ہم نوا بنا لیا گیا۔ اب صورت حال بالکل وہی ہوگئی تھی کہ ننانوے اندھے ایک ساتھ بیٹھے ہوں اور ایک اندھا آکر ان سب کو بتائے کہ وہ آنکھوں والا ہے اور سامنے سے ایک بھیڑیے کو آتا دیکھ رہا ہے۔ پھر سارے کے سارے یک زبان ہوکر بھیڑیا بھیڑیا چلانے لگیں۔ ہو بہو یہی صورت حال پیش آرہی تھی۔ بے چارا امریکا خود صہیونیت کے آگے جھکا ہوا تھا۔ صہیونی لابی اس سے جو کرا رہی تھی، وہ کر رہا تھا۔ اس نے دنیا کو باور کرایا کہ اس کے پاس دہشت گردی کے عالمی نیٹ ورک کی معلومات ہے۔ ہم نہ جاگے تو پوری دنیا برباد ہوجائے گی۔ بس پھر کیا تھا سب کے سب بے سوچے سمجھے دہشت گردی دہشت گردی چلانے لگے۔ ہاتھ سوائے انسانی بربادی کے کچھ نہ آیا۔

اصولی طور پر اس اصطلاح کا مطلب بالکل واضح ہے۔ یعنی وہ کام جس سے انسانوں میں دہشت پیدا ہو۔ اسی طرح دہشت گرد کا مطلب ہوا، وہ انسان جس کی کوئی حرکت انسانوں کو دہشت زدہ کردے۔ اس تعریف کو سامنے رکھ کر گزشتہ دس برسوں میں ہونے والی انسانی بربادی کی تاریخ دیکھیے۔ بہت آسانی کے ساتھ آپ یہ سمجھ لیں گے کہ کون سی حکومت، جماعت، تنظیم یا انسان دہشت گرد ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو حکومت، تنظیم یا انسان دہشت گرد ہو، وہ انسانیت کا مجرم ہے اور اسے سخت سزا ہونی چاہیے۔ یہ تھا دہشت گردی کا حقیقی مفہوم اور اس کا حکم۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ اندھوں کا جو گروہ دہشت گردی سے دنیا کو ڈرا رہا ہے، وہ اس حقیقی تعریف کو نہیں مانتا۔ اس نے اس ایک لفظ میں کئی چیزوں کو مخفی مانا ہے۔ دنیا کو یہ اصطلاح ویسی ہی نظر آرہی ہے، جیسی یہ ہے۔ لیکن ان اندھوں کی آنکھیں اس میں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ دہشت گرد مسلمان ہو، امریکی دہشت گردی یا دہشت گردانہ پالیسیوں پر قولی یا عملی تنقید کرتا ہو، صہیونیت کو دنیا کے لیے خطرہ سمجھتا ہو، حکم راں طبقے کی برگزیدگی کا قائل نہ ہو اور ان کی

پالیسیوں میں غلطی کا امکان رکھتا ہو، اسلامی نظام کو دنیا کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا ہو، امریکہ یا اس کے حلیف کسی بھی ملک کو اس کا کوئی عمل ناگوار ہو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آنکھوں والوں کے لیے دہشت گردی کی یہ احمقانہ، جاہلانہ اور گم راہ کن تعریف ناقابل قبول ہے۔ اس تعریف کو درست مانیں تو گاندھی جی، نیلسن منڈیلا، شاہ سعود اور شیخ محمد بن عبدالوہاب سب کے سب دہشت گرد قرار پائیں گے۔ کیوں کہ ان لوگوں نے اور ان کے لاتعداد متبعین نے حکومت وقت کے خلاف اپنے اپنے طور پر اقدامات کیے۔ لیکن انہیں کوئی دہشت گرد نہیں کہتا۔ بل کہ انہیں قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے اور اپنے اپنے ملکوں میں ان سب کے افکار وخیالات کو رہ نما تسلیم کیا جاتا ہے۔

حال ہی میں صہیونیت کی سرپرستی اور امریکا کی قیادت میں دہشت گردی مخالف مہم کے نام سے چلنے والی اس اسلام مخالف مہم میں ایک نیا موڑ آیا۔ ہوا یہ کہ عالم اسلام کے قلب وجگر یعنی حرمین شریفین اور پورے حجاز مقدس پر قائم موجودہ حکومت کے ذریعے عالم اسلام کی سب سے بڑی اور منظم اسلامی تحریک جماعت الاخوان المسلمون کو دہشت گرد قرار دلوا دیا گیا۔ پوری دنیا ششدر رہ گئی۔ دشمنان اسلام مسرت آمیز حیرانی میں مبتلا ہوئے۔ اللہ بھلا کرے امیر قطر کا، جنہوں نے صہیونیت کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اخوان کی حمایت جاری رکھنے اور مصر میں اسرائیل کی سرپرستی میں ہونے والی فوجی بغاوت کا ساتھ دینے سے منع کر دیا۔ اس طرح اخوان کو دہشت گرد ثابت کرنے والی قرارداد کو بے حقیقت اور بے روح بنا دیا۔ لیکن اس وقت نہ مصر کی فوجی بغاوت موضوع گفتگو ہے اور نہ اسلام پسندوں کے خلاف عرب حکم رانوں کا شرم ناک رویہ۔ نہ مقصود اخوان کی تعریف کرنا ہے اور نہ ان کو بے قصور ثابت کرنا۔ گفتگو صرف یہ کرنی ہے کہ واقعتاً اگر اخوان دہشت گرد ہیں تو ان کو دہشت گرد کہنے کے کیا ''تقاضے'' ہیں۔ عرب حکم راں ان تقاضوں کو پورا کریں۔ ورنہ ہاتھ میں دہشت گردی مخالف مہم کے نام سے ڈگڈگی لے کر صرف گھومنے سے کیا فائدہ؟ وہ لازمی تقاضے یہ ہیں:

۱۔ تحریک اخوان کے قیام کو ایک صدی مکمل ہونے والی ہے۔ اس طویل عرصے میں کسی پر یہ راز منکشف نہیں ہوا کہ وہ دہشت گرد ہیں۔ دوسروں کی تو بات ہی نہ کیجیے خود سابق سعودی حکم راں شاہ فیصل بن عبدالعزیز شہید کا یہ تاریخی جملہ بھی سب کو یاد ہے کہ "الاخوان إبطال، يجاهدون في سبيل الله بأموالهم و بأنفسهم" (اخوان اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والے ہیرو ہیں)۔ اسی طرح سعودی حکومت اخوانی رہنماؤں کی کتابیں بھی شائع کر کے تقسیم کراتی رہی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم علامہ عبدالعزیز بن باز نے اپنے فتووں میں صاف طور پر اخوان کو ان جماعتوں میں شامل کیا ہے، جو حق پر ہیں اور حماس کی حمایت کی اپیل اور ان کے حق پر ہونے کا فتویٰ بھی جاری فرمایا ہے۔ (اتنا ضرور ہے کہ علامہ بن باز اور دوسرے سنجیدہ سعودی علماء نے اخوان کے ساتھ اپنے فکری اختلاف کو بھی بیان کیا ہے، لیکن اس کی حیثیت صرف علمی وفکری اختلاف کی ہے۔ آج اگر سعودی حکومت کو معلوم ہوا کہ اخوان اور حماس دہشت گرد تنظیمیں ہیں تو اسے چاہیے کہ شروع ہی سے ''اخوانی وحماسی دہشت گردوں'' کے ساتھ اپنے روابط پر دنیا سے معافی مانگے۔ شاہ فیصل شہید، شاہ خالد، شاہ فہد اور علامہ بن باز کے ذریعے اخوان اور حماس کی زبانی یا عملی حمایت کو ''دہشت گردی کی حمایت'' کہہ کر ان حضرات کے فتووں یا فیصلوں کو ناواقفیت اور نادانی پر مبنی قرار دے۔

۲۔ خود موجودہ فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز بھی ابھی ایک

سال پہلے تک مصری صدر ڈاکٹر محمد مرسی کا کھلے دل سے استقبال کررہے تھے اور غزہ کی حکومت کو امداد پہنچا رہے تھے۔ آج زندگی کے آخری دنوں میں جب ان پر ''حق'' واضح ہوگیا ہے، تو انہیں چاہیے کہ پوری دنیا سے دہشت گردوں کی اس کھلی حمایت پر معافی مانگیں۔ اس درمیان مصر کی فلاح کے لیے کیے جانے والے تمام معاہدات کو منسوخ کریں اور حماس اور فتح کے درمیان کرائے جانے والے اس تاریخی ''مکہ معاہدے'' کو بھی منسوخ کریں، جس کی وجہ سے دنیا میں انہیں بہت سراہا گیا تھا اور عالم اسلام میں اعتماد و وقار حاصل ہوا تھا۔

۳۔ ماضی میں جب دہشت گردی کی اصطلاح کو رائج کیا گیا تو اصل نشانہ اسامہ بن لادن کو بنایا گیا تھا۔ امریکا پر ہونے والے حملے میں اسامہ کا نام لے کر ان کے افغانستان میں چھپے ہونے کی بات کی گئی تھی۔ افغانستان کی طالبان حکومت نے جب اسامہ کو امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو اسے دہشت گرد حامی بتا کر جنگ چھیڑ دی گئی۔ کیوں کہ امریکا کا اعلان تھا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں، وہ دہشت گردوں کے ساتھ ہے۔ بالکل اسی طرح آج اخوان اور حماس کو دہشت گرد قرار دینے کے بعد ان ممالک کے ساتھ مکمل قطع تعلق کیوں نہیں کیا جارہا ہے، جو اخوان یا حماس کے ساتھ ہیں؟ حد تو یہ ہے کہ قطر جیسے چھوٹے سے ملک کے ساتھ بھی بہت محتاط دشمنی کی جارہی ہے۔ ''دہشت گردوں'' کی نشان دہی ہرگز کافی نہیں، سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک کو چاہیے کہ وہ ''دہشت گردی'' کے خاتمے کی عملی تدبیر کرتے ہوئے دنیا کے ہر اس ملک پر حملہ کریں، جہاں یہ ''دہشت گرد تنظیمیں'' کھل کر کام کررہی ہیں۔

۴۔ سعودی حکومت ہر سال فیصل ایوارڈ اور دبئی حکومت اسلامی شخصیت ایوارڈ دیتی ہے۔ ان دونوں حکومتوں کو چاہیے کہ اب تک انہوں نے جن جن ''دہشت گردوں'' یا ان کے حامیوں کو یہ ایوارڈ دیے ہیں، ان سب کو کالعدم قرار دینے کا اعلان کردیں۔

۵۔ جس طرح اخوان کے فلسطینی ایڈیشن حماس کو دہشت گرد قرار دیا گیا ہے، اسی طرح تیونس، لبنان، یمن، لیبیا، شام، انڈونیشیا، ملیشیا، امریکا، انگلینڈ، فرانس، کینڈا، پاکستان، ہندستان، بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک میں بھی اخوانی فکر رکھنے والی یا ان کی حمایت کرنے والی جماعتوں، اداروں اور افراد کو بھی دہشت گرد قرار دیا جائے۔ مزید یہ کہ ان کی دہشت گردانہ کارروائیوں کے ثبوت جمع کرکے متعلقہ حکومت تک بھی پہنچائے جائیں، تاکہ پوری دنیا ان ''خطرناک دہشت گردوں'' کا خاتمہ کرسکے۔

یہ وہ اقدامات ہیں، جو ماضی میں عالمی طور پر دہشت گرد قرار دیے جانے والے افراد اور تنظیموں کے ساتھ کیے جاچکے ہیں اور حقیقی دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے ضروری بھی ہیں۔ موجودہ سعودی حکومت اور عرب لیگ میں شامل دوسرے ممالک کو چاہیے کہ فوری طور پر یہ اقدامات کریں۔ اگر مستقبل قریب میں یہ اقدامات کیے جاتے ہیں، تب تو یہ سمجھا جائے گا کہ واقعی یہ ممالک اخوان اور حماس کو دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر نہیں کیے جاتے تو مطلب صاف ہے۔ **امریکا کی طرح دہشت گردی کا ہنگامہ کرکے صرف اپنے مفادات کی حفاظت مقصود ہے۔ چاہے اس کے لیے ہزاروں انسانوں کو تہہ تیغ کرنا پڑے۔ ہاں! امریکا اور ان عرب ممالک کے ہنگامے میں ایک چیز مشترک ہے۔ صہیونیت کے در پہ سجدہ ریزی۔ امریکا نے بھی صہیونیت کے اشارے پر دہشت گرد مخالف مہم چھیڑی تھی اور ان عرب ممالک نے بھی۔**

☆☆☆